وہ نماز روزہ کی چنداں پرواہ نہ کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود تذکرہ نویسوں کے ہاں اسی طرح قابلِ احترام اور بلاریب ولی ہیں۔ جس سے صوفیاء کے اس دعوے کی تردید ہو جاتی ہے کہ طریقت شریعت سے ہی ماخوذ ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

۳۔ ان مادر زاد ولیوں کی جو کرامات بیان کی گئی ہیں وہ کرامت کی شرائط پوری نہیں کرتیں۔ ان سے نہ کوئی اشد دینی ضرورت پوری ہوتی ہے نہ دنیوی۔ لہٰذا یہ کرامات نہیں، بلکہ استدراجات ہیں۔

۲۔ اِک نگاہِ کرم سے بننے والے ولی

پیرانِ پیر جناب شیخ عبدالقادر جیلانی کے دو واقعات پہلے درج کر آتے ہیں کہ کس طرح ان کی ایک نگاہِ کرم نے ایک چور کو اور دوسری دفعہ ایک کافر کو ابدال کے مقام پر پہنچا دیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں کئی دوسرے ولی ان سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ مثلاً مولانا محمد زکریا صاحب اپنی تصنیف "تاریخ مشائخ چشت" شیخ نظام الدین العمری تھانیسری (م ۱۰۲۴ھ) کے حالات میں لکھتے ہیں کہ:

۱۔ "جس شخص پر نظر ڈالتے تھے ایک ہی وہلہ میں صاحب شہود ہو جاتا تھا۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے ولی تراش نام رکھ دیا تھا۔" (تاریخ مشائخ چشت، ص ۲۱۵)

۲۔ یہی مولانا زکریا صاحب خواجہ ابوہبیرہ بصری (م ۲۸۷ھ) کے متعلق لکھتے ہیں:

"آپ کا جو شخص منظورِ نظر ہو جاتا تھا۔ ایک توجہ سے فوراً اس پر علوم منکشف ہو جاتے تھے۔"

(تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۴۷)

اور یہ تو ظاہر ہے کہ یہ علوم لدنی یا باطنی ہی ہو سکتے ہیں جن کی ان اولیاء اللہ کو ضرورت ہوا کرتی ہے۔

۳۔ حضرت نور محمد بدایونی کی مرزا مظہر جان جاناں پر توجہ ڈالنے کا ذکر ہو رہا ہے۔

"مگر اس وقت بغیر درخواست کے (نور محمد صاحب نے) مرزا صاحب سے فرمایا کہ آنکھیں بند کر کے دل کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ اور ایک ہی توجہ میں لطائف خمسہ کا ذاکر بنا کر رخصت کیا۔ آپ کی توجہ کی تاثیر نے باطن کو اس قدر متاثر اور منور کر دیا کہ دوسرے روز جب (مرزا مظہر جان جاناں نے) حضرت سید صاحب کی خدمت میں حاضری کا قصد کیا اور حسبِ عادت آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو بعینہ حضرت سید کی معلوم ہوئی۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۲۱۷)

گویا سید صاحب کی ایک توجہ نے کئی مرحلے طے کروا دیئے۔ ایک تو تصورِ شیخ میں کامل بنا دیا۔ دوسرے لطائف خمسہ کا ذاکر بھی بنا دیا۔ یہ لطائف پانچ ہیں یا چھ ہیں یا سات؟ اس بات میں بھی ان حضرات نے اختلاف کیا ہے اور یہ لطائف کون کون سے ہیں۔ اس کی تفصیل باطنی علوم کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔ بہرحال سید صاحب نے اس توجہ میں مرزا مظہر کو پانچ لطائف کا ذاکر بنا ڈالا تھا۔

۴۔ خواجہ محمد فضیل صاحب قادری نوشاہی کے تذکرہ میں صاحب خزینۃ الاصفیاء فرما رہے ہیں :

"جس فاسق و فاجر پر حالتِ جذب و سکر میں (فضیل صاحب نوشاہی کی) نظر پڑ جاتی۔ عارفِ کامل ہو جاتا۔ کسی مُردہ پر نظر پڑتی تو زندہ ہو جاتا۔ نگاہِ غضب سے کسی کو دیکھتے تو اس کی جان تن سے نکل جاتی۔ غرض آپ کے احوال و مقامات عجیب و غریب تھے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۷۷)

یہ یاد رہے کہ یہ نوشاہی حضرات انتہا درجہ کے بے دین، تارکِ صوم و صلوٰۃ، بھنگ چرس اور سماع و وجد کے رسیا ہوتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک مجذوب کی یہ کرامات بیان ہو رہی ہیں۔ منجملہ یہ کہ وہ ایک ہی نظر میں فاسق و فاجر لوگوں کو بھی عارفِ کامل بنا ڈالتے تھے۔ اب جیسے یہ عارفِ کامل بنتے ہوں گے اس کا اندازہ خود فرما لیجئے۔

۵۔ اسی طرح کے ایک اور نوشاہی شاہ عبدالرحمٰن ہیں۔ مجذوب تھے۔ لوگ انہیں رحمان دیوانہ کہا کرتے تھے۔ ان کے فضائل و مناقب یہ ہیں کہ :

"گرمیوں کے موسم میں سورج کی دھوپ میں بیٹھتے اور سردیوں میں برہنہ تن رات کو جنگل میں جا کر بیٹھ جاتے اور کبھی سردیوں میں دریا میں کھڑے ہو کر ذکرِ حق میں مشغول ہوتے۔ آپ کی گرمیٔ ذکر سے دریا کا پانی گرم ہو جاتا۔ جس شخص پر نگاہِ شفقت ڈالتے وہ صاحبِ کشف و کرامات ہو جاتا۔" (خزینۃ الاولیاء، ص ۳۴۸)

۶۔ اس نظرِ کرم یا توجہ کا اثر اتنا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ عام انسان یا فاسق و فاجر تو درکنار کتوں پر پڑ جائے تو انہیں بھی صاحبِ کشف و کرامت اور ولی بنا دیتی ہے۔ چنانچہ اشرف علی تھانوی صاحب جنید بغدادی کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

"۲۲۸۔ فرمایا (یعنی اشرف علی صاحب کے پیر امداد اللہ مہاجر مکی نے) حضرت جنید بغدادی بیٹھے تھے۔ ایک کُتا سامنے سے گزرا۔ آپ کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اس قدر صاحب کمال ہو گیا کہ شہر کے کُتے اس کے پیچھے دوڑے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ سب کُتوں نے اس کے گرد حلقہ باندھ کر مراقبہ کیا۔" (امداد المشتاق از حکیم الامت اشرف علی تھانوی، ص ۱۰۲)

یہ کتے بیچارے تو غیر مکلف مخلوق تھے۔ اس بیچارے کو خواہ مخواہ صاحب حال بنا دیا۔ پھر دوسرے یہ کہ اس کا مراقبہ بھی شروع ہو گیا اور اس طرح کتوں میں ولایت کی داغ بیل ڈال دی۔ پھر لطف یہ کہ یہ نگاہ بھی اتفاقاً پڑ گئی تھی۔ اگر آپ عمداً نگاہِ کرم فرماتے تو خدا معلوم اس کتے کو کتنا بلند مقام حاصل ہو جاتا۔ رہے وہ انسان جن پر آپ کی زندگی میں نظر پڑ گئی یا آپ نے ڈالی تھی، تو ان کے ولی ہونے میں کسی کو کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

۳۔ تربیّت یافتہ ولی اور طریقِ تربیّت

کہا جاتا ہے کہ تزکیہ نفس کا دوسرا نام تصوف ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے تزکیہ نفس پر حضور اکرم بھی مامور تھے اور یہی کام صوفیار بھی کرتے ہیں۔ اب درج ذیل طریقہ ہائے تربیّت ملاحظہ فرمائیے اور یہ فیصلہ خود فرما لیجئے کہ آیا رسولِ اکرم ﷺ اسی طرح سے اور اسی طرح کا تزکیہ نفس فرمایا کرتے تھے۔

ا۔ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) کا طریقۂ کار

آپ کا ایک مرید ۳۰ سال آپ کی خدمت میں رہا وہ رات کو نہ کبھی سوتا اور نہ ہی کبھی روزہ چھوڑتا تھا مگر باطنی علوم اس پر منکشف نہ ہوتے تھے۔ آخر تنگ آ کر حضرت شیخ سے اس بات کی شکایت کی تو بایزید نے فرمایا "تم تین سو سال بھی لگے رہو تو یہ علم حاصل نہ کر سکو گے۔" مرید نے پوچھا: "اس کا کوئی علاج ہے؟" فرمایا "علاج تو ہے، مگر تم کر نہ سکو گے۔" جب مرید نے اصرار کیا تو آپ نے علاج یہ بتلایا کہ "اپنی ڈاڑھی اور سر منڈا دو، گوڈری پہن لو، باداموں کا ایک کشکول ہاتھ میں لے کر اپنے گرد بچوں کو جمع کرو اور کہو جو بچہ مجھے ایک گھونسا مارے گا، اسے ایک بادام دوں گا۔ اسی طرح گلی گلی پھرو۔" مرید نے کہا: "سبحان اللہ کیا علاج ہے؟" بایزید نے کہا "تیرا سبحان اللہ کہنا بھی شرک ہے، کیونکہ تو یہ کلمہ اپنی پاکیزگی بیان کرنے کے لئے کہہ رہا ہے۔" مرید نے کہا مجھ سے یہ علاج نہیں ہو سکتا کوئی اور بات بتلائیے۔" بایزید نے کہا "اگر یہ علاج نہیں کر سکتا تو تیرا کوئی علاج نہیں۔" (احیاء العلوم، ص ۳۵۸، ج ۴، مصنفہ امام غزالی)

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد امام غزالی لکھتے ہیں کہ "جس شخص کا دل بیمار ہے وہ اپنے نفس کے تابع ہے اس کا وہی علاج ہے، جو بایزید نے تجویز کیا۔" (حوالہ ایضاً)

اب دیکھئے اس مرید بیچارے نے تین خلافِ شرع کام تو پہلے ہی کر لئے تھے۔ (۱) رات کبھی نہ سونا،

(۲) روزہ کبھی نہ چھوڑنا اور (۳) دینِ طریقت پر ایمان۔ اب بایزید صاحب نے ولایت کی تکمیل کے لیے یہ چار خلافِ سنّت اور کام بتلا دیتے: (۱) داڑھی منڈوانا (۲) گودڑی پہننا (۳) دَر دَر کی گدائی اور (۴) بچوں سے گھونسے کھانا۔ پھر جب ایسے کاموں پر معذرت کرنے لگا، تو آپ نے اسے ولایت کے لئے نااہل اور لاعلاج مریض قرار دے دیا۔

پھر امام غزالی صاحب نے بھی اِن تمام خلافِ سنّت کاموں کے علی الرغم بایزید کے علاج کی ہی حمایت فرمائی اور اس 'دل کے بیمار' مرید پر ہی عتاب فرمایا:

۲۔ جنید بُغدادی (م ۲۹۸ھ) کا طریقِ تربیت

"ایک روز شبلیؒ نے حضرت جنیدؒ سے کہا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے گوہرِ آشنائی (معرفت) عطا فرمایا ہے اسے یا تو بیچ دیجئے یا بخش دیجئے۔" شیخ جنید نے فرمایا: "نہ فروخت کروں گا نہ بخشوں گا۔ فروخت کروں تو تیرے پاس ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں۔ مفت دُوں تو یہ موتی تیرے ہاتھ مفت میں آ جائے گا۔ مردانِ باہمت کی طرح اپنے آپ کو دریائے معرفت میں ڈال اور گوہرِ مقصود حاصل کر۔" شبلی نے پوچھا: "پھر کیا کروں؟" فرمایا: "ایک سال تک کبریت فروشی کر (دیا سلائی بیچ)" ایک سال گزرنے کے بعد شیخ شبلی، مُرشد کی خدمت کی حاضر ہوئے فرمایا: "اب ایک سال تک بغداد کے کوچہ و بازار میں گدائی کر مگر اس طرح کہ کسی دوسرے کام میں مشغول نہ ہونا۔" شیخ شبلی فرمودہ مُرشد کے مطابق بغداد کے بازاروں میں گداگری کرتے رہے۔ مگر کسی شخص نے آپ کو ایک حبّہ بھی نہ دیا۔ سال گزرنے کے بعد خدمتِ شیخ میں حاضر ہوتے۔ "فرمایا: "کیوں شبلی! اپنی قدر و قیمت معلوم ہوئی؟ کوئی شخص تیری طرف متوجہ بھی نہ ہوا۔ اچھا اب نہاوند جا، جہاں تو حکومت کرتا رہا ہے۔ وہاں ایک سال دریوزہ گری کر۔" چنانچہ آپ وہاں پہنچے۔ کسی نے آپ کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ دیا۔ سال گزار کر خدمتِ مرشد میں آئے۔ شیخ جنید نے فرمایا: "شبلی! ابھی ایک سال اور بغداد کے کوچہ بازار میں گدائی کر۔" چنانچہ حکمِ شیخ کے مطابق آپ بغداد کی گلیوں میں بھیک کا ٹھیکرا لئے بھک منگا بن کر بھیک مانگتے رہے۔ شام کو خانقاہ شیخ میں بھی حاضر ہوتے اور بھیک کے ٹکڑوں کو خدمتِ مُرشد میں پیش کرتے اور شیخ انہیں درویشوں میں تقسیم کر دیتے۔ ایک سال گزرنے کے بعد حضرت جنید نے پوچھا: "کیوں شبلی! اب تیرے نفس کا حال تیرے نزدیک کیا ہے؟" عرض کیا پیر و مُرشد! اپنے آپ کو خلقِ خدا کی کمترین مخلوق سمجھتا ہوں۔" فرمایا: "اب تیرا ایمان درست

ہوا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۴۵۔۱۴۶)

دیکھا آپ نے سید الطائفہ جناب جنید بغدادی نے اپنے بعد میں ہونے والے خلیفہ ابوبکر شبلی کی تربیت کے لئے کیسا شاندار پروگرام تجویز کیا۔ پہلے سال تو خیر انہوں نے ماچسیں بیچیں۔ دوسرے اور تیسرے سال شبلی کو گداگری کے ذریعہ نہ کہیں سے حبہ ملا نہ ٹکڑا۔ یہ بھی دراصل سید الطائفہ کی کرامت ہی تھی کہ انہیں دو سال کچھ نہ ملا۔ ورنہ بھک منگے گداگر آج بھی موجود ہیں۔ ایسا ہونا ناممکن ہے کہ کسی کو دو سال تک کچھ نہ ملا ہو۔ اور چوتھے سال جو گداگری کے ٹکڑے آتے رہے وہ گویا سب کے سب حلال و پاکیزہ رزق کے تھے، جو آپ درویشوں میں بانٹتے رہے۔ خیر کچھ بھی ہو چار سال بعد آپ نے شبلی کے ایمان کو درست کر دیا، جس کے بغیر معرفت کا موتی ہاتھ نہ آسکتا تھا۔

شیخ شبلی پر ولایت کے اثرات

اور اس طرح جو معرفت ابوبکر شبلی کو ملی اس کے متعلق صاحب خزینۃ الاصفیاء فرماتے ہیں: "روایت ہے شیخ شبلی کچھ عرصہ اپنے مقام سے غائب رہے۔ ہر چند تلاش کیا نہ پایا۔ ایک روز مخنثوں کے گروہ میں دیکھے گئے (شاید نماز بھی انہیں کے ساتھ پڑھتے رہے ہوں گے) لوگوں نے پوچھا: "کیا بات ہے؟" فرمایا: "یہ گروہ دنیا میں نہ مرد ہے نہ عورت۔ میں بھی اسی حالت میں گرفتار ہوں۔ نہ مرد ہوں نہ عورت۔ پس ناچار میری جگہ انہی میں ہے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۴۷)

اب دیکھئے رسول اللہ بھی تزکیۂ نفس فرمایا کرتے تھے لیکن طریق کار جداگانہ ہونے کی وجوہ دو ہیں:

۱۔ شرعی اصطلاح میں تزکیۂ نفس سے مراد دلوں کو شرک اور کفر کی آلائشوں نیز اخلاقِ رذیلہ سے پاک کرنا ہے۔ جبکہ طریقت میں تزکیۂ نفس سے مراد معرفت کا موتی تلاش کرنا ہے جس سے کشف و کرامات کا صدور ہو۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ اس مقصد کے حصول کے لئے شرعی تعلیمات پر زور دیتے اور نگرانی فرماتے تھے۔ چونکہ شریعت کی نظروں میں انسان تمام مخلوقات سے برتر ہے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کا طریق تربیت ایسا تھا جس سے کسی کی عزت یا وقار مجروح نہیں ہوتا تھا۔ لیکن یہ گروہ صوفیہ نفس کشی کے درپے ہوتے ہیں اور انسان کو تمام مخلوق سے کمتر درجہ پر لانا چاہتے ہیں۔ اور اسے انتہائی ذلیل بنا دینا ان کا طریق کار ہے

گداگر کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے تو فرمایا تھا کہ قیامت کے دن اٹھے گا تو اس کے چہرے پر گوشت نہ ہو گا۔ لیکن صوفیوں کے ہاں یہی گداگری کا طریقہ حصول ولایت کے لیے ضروری ہے۔ یہ ہے ان لوگوں کی اتباع سنت کا نمونہ۔ اور پھر اس تربیت کا منطقی نتیجہ بھی یہی کچھ نکلنا چاہیئے تھا کہ شبلی مخنث بن گئے۔ نہ مرد رہے نہ عورت۔

۳۔ شیخ نظام العمری (م ۱۰۳۴ھ) ولی تراش کا طریق تربیت

نظام الدین اپنے ایک مرید ابوسعید نعمانی کو طریقت سکھلا رہے ہیں:

"جب کئی دن گزر گئے تو شاہ ابوسعید نے عرض کیا کہ حضرت میں گنگوہ سے بلخ تک پیدل چل کر دعوتوں کے لئے نہیں آیا۔ فرمایا: "صاحبزادے پھر جو خاص مطلب ہو بیان فرمایئے۔" کہا: "میں وہ دولت لینے آیا ہوں جو آپ میرے گھر سے لائے ہیں۔" (نظام الدین، ابوسعید کے آباؤ اجداد کے مرید تھے۔ یہاں بھی دولت سے مراد وہی معرفت کا موتی ہے) بس یہ سنتے ہی شیخ کا رنگ بدل گیا اور فرمایا: "صاحبزادے! اگر دولت لینا چاہتے ہو تو پھر یہ شان و شوکت رخصت کرو اور آج سے حمام کی خدمت تمہارے سپرد ہے جا کر حمام جھونکو اور نقیب سے فرمایا کہ ان کو لنگر کی روٹی صبح و شام دے دیا کرو اور فرمایا جب تک ہم اجازت نہ دیں اس وقت تک ہمارے سامنے نہ آؤ۔" نہ ذکر بتلایا نہ شغل۔ بس نماز روزہ کرتے اور حمام جھونکتے رہے۔ اسی حالت میں ایک عرصہ گزر گیا۔ اس کے بعد حضرت شیخ نے بھنگن سے فرمایا کہ "آج کوڑا کرکٹ ابوسعید کے سر پر ڈال دینا۔" بھنگن نے ایسا ہی کیا، تو شاہ ابوسعید نے غصہ سے فرمایا کہ "نہ ہوا گنگوہ ورنہ آج تجھے حقیقت معلوم ہو جاتی۔" بھنگن نے عرض کر دیا کہ آج ابوسعید نے یہ کہا تھا۔ فرمایا: "ارے ابھی تو خناس دماغ میں گھسا ہوا ہے۔ گنگوہ کی بوئے ریاست نہیں نکلی، ابھی اور حمام جھونکیں۔" چنانچہ اور عرصہ گزر گیا، پھر دوبارہ بھنگن کو حکم دیا۔ چنانچہ اس نے پھر ایسا ہی کیا۔ اس وقت شاہ ابوسعید نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر تیز نظروں سے گھور کر دیکھا۔ شیخ نے یہ حال سن کر فرمایا کہ "ابھی تو کسر باقی ہے۔" چنانچہ ایک عرصہ تک اور یہی خدمت جاری رہی۔ اس کے بعد پھر وہی حکم ہوا۔ بھنگن نے پھر ایسا ہی کیا کہ سارا کوڑا کرکٹ ابوسعید کے سر پر ڈال دیا۔ اس وقت شاہ ابوسعید کا حال بالکل بدل گیا تھا۔ کوڑا جو گر گیا تھا وہ اپنے اوپر ڈالنے لگے۔ بھنگن نے جا کر شیخ سے یہ حال عرض کیا، تو فرمایا: "الحمد للہ اول قدم تو طے ہوا۔ واقعی

یہ تکبر ہی راستہ میں حائل ہوتا ہے۔ یہ نکل جائے، تو پھر بہت جلد طریق طے ہو جاتا ہے۔" اس ریاضت کے بعد شاہ ابوسعید کو اتنی اجازت ملی کہ شیخ کی مجلس میں آجایا کریں۔ کچھ عرصہ بعد ذکر تعلیم کیا گیا۔ ذکر شروع کرنے کے بعد کچھ حالات و کیفیات طاری ہوئیں تو شیخ کو معلوم ہوا کہ ابوسعید میں عجب پیدا ہو گیا ہے تو سب ذکر و شغل چھڑا دیئے اور کتوں کی خدمت سپرد ہوئی۔ دو شکاری کتے تھے۔ ایک دن شاہ ابوسعید اُن کو جنگل لے گئے۔ راستہ میں کوئی شکار نظر آیا۔ جس کو دیکھ کر کتے اس کے پیچھے دوڑے۔ شیخ سعید کچھ راستہ تو اُن کے ساتھ چلے مگر تھک گئے۔ پھر اس خیال سے کہ کتے بے قابو نہ ہو جائیں اور شیخ ناراض نہ ہوں۔ زنجیر کو اپنی کمر سے باندھ لیا۔ اب حال یہ ہے کہ کتے بھاگے جا رہے ہیں اور یہ ساتھ ساتھ گھسٹتے جا رہے ہیں کہیں ڈھیلوں پر سر لگتا ہے کہیں کانٹوں سے بدن زخمی ہوتا ہے۔ اسی حالت میں ان پر غیبی فضل ہوا کہ ایک تجلی خاص ان کے اوپر ہوئی۔ جس کی لذت نے تمام تکلیف کو بھلا دیا۔ ادھر حضرت شیخ کو یہ حالت منکشف ہوتی اور انہوں سے خدام سے فرمایا کہ "اس وقت ابوسعید پر فضل ہو گیا اور ایک تجلی خاص سے حق تعالےٰ نے اُن کو مشرف فرمایا۔ جاؤ جنگل سے انہیں اٹھا لاؤ۔" خدام تو ادھر دوڑے اور اُدھر سلطان نظام الدین پر شیخ المشائخ عبدالقدوس کی رُوحانیت منکشف ہوئی اور فرمایا: "نظام الدین تم کو اس سے زیادہ مشقت لینے کا بھی حق تھا، مگر ہم نے تو تم سے اتنی مشقت نہیں لی تھی۔" یہ ایک محبت آمیز عتاب تھا جس سے سلطان نظام الدین کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ابوسعید آئے تو اسے سینے سے لگایا اور خاطر و مدارات ہونے لگی"...... شاہ ابوسعید کو اس روز کی تجلی کا بہت اشتیاق تھا۔ روزانہ ذکر کر کے اس کے مشتاق رہتے جب کئی روز تک نہ ہوئی تو ایک دن حبس دم کر کے بیٹھ گئے اور پختہ ارادہ کر لیا کہ جب تک وہ تجلی نہ ہو گی سانس نہ چھوڑوں گا۔ چاہے مر جاؤں۔ کیونکہ ایسی زندگی سے مرنا ہی اچھا ہے۔ بالآخر وہ تجلی ہوئی اور اس کی مسرت میں سانس اس زور سے چھوٹا کہ پسلی پر ضرب پہنچی اور ٹوٹ گئی۔ اس وقت غیب سے ایک ہاتھ نمودار ہوا جس میں چمچہ کے اندر کوئی دوا تھی وہ ان کے منہ میں لگا دی گئی اور اس کے کھاتے ہی فوراً پسلی جڑ گئی اور اسی کے ساتھ یہ ارشاد بھی ہوا کہ "چوزہ کا شوربا چند روز تک دینا۔" شیخ نے فوراً چوزہ کا انتظام کر دیا اور کئی روز تک چوزے کھلاتے گئے۔ بالآخر شیخ نے تکمیل کے بعد اپنا نائب بنا کر گنگوہ واپس کیا۔" (تاریخ مشائخ چشت

ص ۲۲۰)

اس طویل قصہ سے کئی امور پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ طریقت کی تربیت کی جو منازل جنید بغدادی نے گداگری کے ذریعہ طے کرائیں۔ نظام الدین صاحب نے وہی منازل بھنگن کے کوڑا پھینکنے کے ذریعہ طے کرائیں اور یہ بھنگن اس کارِ طریقت کا ایک اہم رُکن تھی۔

۲۔ سنا تھا کہ بعض پیرزادے شکاری کتوں کا شوق فرماتے ہیں، اب معلوم ہوا کہ ان سے راہِ طریقت کی تربیت میں بھی مدد لی جاسکتی ہے۔

۳۔ جس چیز کو شیخ نظام الدین تکبر سے تعبیر فرما رہے ہیں، وہ تکبر نہیں بلکہ ذلت و تحقیر اور اہانت نفس کا احساس ہے جو ایک مومن کو کسی قیمت پر گوارا نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے تکبر کی تعریف یوں بیان فرمائی کہ: "تکبر یہ ہے کہ تو حق بات کی پرواہ نہ کرے اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھے۔" اب بتلائیے کہ یہ تعریف بھنگن کے کسی مسلمان پر غلاظت کا ڈھیر پھینکنے پر صادق آسکتی ہے۔ عزتِ نفس کو تکبر کہنا تو وہی درست قرار دے سکتا ہے جو نفس کشی کے درپے ہو اور معرفت کے موتی تلاش کر رہا ہو۔ جس کا شریعت نے قطعاً کوئی حکم نہیں دیا۔ نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے ایسا موتی اس طرح طرح کے بیہودہ طریقوں سے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

۴۔ ابو سعید پر جو تجلی ہوئی وہ چونکہ شریعت کے تابع نہ تھی لہٰذا وہ یقیناً استدراج تھا۔ جیسا کہ جنید بغدادی کا ایک مرید ہر رات کو بہشت کی سیر کیا کرتا تھا اور یہ شیطانی عمل تھا۔

۵۔ اِن مُرشد و مرید دونوں کے شیخ المشائخ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) وہی صاحب ہیں جنہوں نے پانی بننے میں ہندو جوگی سے مقابلہ رچایا تھا اور فرق یہ رہ گیا تھا کہ جوگی کے پانی سے بُو آتی تھی اور آپ کے پانی سے خوشبو۔

۶۔ ندائے غیب کی باتیں تو خیر صوفیاء کے تذکروں میں اکثر ملتی ہی رہتی ہیں البتہ ہاتھ کے برآمد ہونے اور اس ہاتھ میں چمچہ اور اس چمچہ میں پسلی ٹوٹنے کے علاج والا لطیفہ بھی خوب ہے اور اچھے مقام پر فٹ کیا گیا ہے۔

۴۔ ابُوسعید چشتی صابری گنگوہی (م ۱۰۴۰ھ) کا طریق تربیت

اب وہی ابُو سعید جنہوں نے اپنے مُرشد نظام الدین عمری سے اس طرح تربیت پا کر فیض حاصل کیا تھا، اِن کا طریقۂ واردات بھی ملاحظہ فرمائیے:

"سواطع الانوار میں لکھا ہے کہ ایک شخص منکرِ حال آپ کے پاس آیا اور عرض کی۔" میں طالب خدا ہوں

مگر طاقتِ مجاہدہ و ریاضت کی مجھ میں نہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کی نظرِ فیض اثر سے مقصودِ دِل حاصل کروں۔" حضرت کے ہاتھ میں اس وقت عصا تھا فرمایا کہ "ہاں ہم اس عصا کی تین ضرب سے طالب کو خدا تک پہنچا دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر ایک ضرب عصا کی اس کے سر پر لگائی۔ عالمِ ملکوت اس پر کُھل گیا اور دوسری ضرب میں عالمِ جبروت، تیسری ضرب میں عالمِ شہود اس پر منکشف ہوگیا۔ تین دن تک بے ہوش رہا۔ جب ہوش میں آیا صدقِ دِل سے مُرید ہوگیا۔" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۹۳)

یہ طریقِ کار تکلیف دہ ضرور ہے مگر اس لحاظ سے اچھا ہے کہ کم ازکم ابو سعید صاحب نے خلافِ شرع کوئی تلقین نہیں فرمائی اور وہ مرید بڑا ہی سخت جان تھا کہ سر میں عصا کی تین ضربیں کھانے پر اس پر صرف عالمِ ملکوت، جبروت اور شہود ہی روشن ہوتے۔ اُس پر تو چودہ طبق روشن ہو جانے چاہئیں تھے۔ البتہ اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ جب اس پر تینوں عالم منکشف ہو گئے اور وہ خُدا تک بھی پہنچ چکا، تو پھر بعد میں مُرید ہونے کا کیا فائدہ تھا۔

۴۔ حضرت خضر علیہ السلام کی تعلیم سے بننے والے ولی

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام ان اولیاء اللہ کو کیا تعلیم دیا کرتے تھے؛ جو اُنہیں ولایت کے درجہ عُلیا تک پہنچا دیتی تھی۔

عبدالخالق غجدوانی (م ۵۷۵ھ) کو خضر کی تعلیم

ایک دن حضرت خضر علیہ السلام سے آپ کی ملاقات ہوئی اور حضرت خضر نے فرمایا کہ "میں تم کو اپنی فرزندی میں لیتا ہوں اور تم کو ایک سبق پڑھاتا ہوں[1]۔ اگر تم اس کی پابندی

[1] معلوم ہوتا ہے کہ گروہ صوفیاء میں سب سے پہلے بزرگ جنہیں حضرت خضر علیہ السلام سے شرفِ ملاقات نصیب ہوا وہ ابراہیم بن ادھم (م ۱۶۲ھ) ہیں۔ صوفیاء کے مخصوص اوراد و ظائف کا آغاز بھی غالباً اسی بزرگ سے ہوا ہے۔ صاحب سیر الاولیاء ص ۴۲ پر لکھتے ہیں کہ:

"منقول ہے کہ خواجہ ابراہیم ادھم نے ایک دفعہ ایک شخص کو صحرا میں دیکھا۔ اس نے آپ کو اسمِ اعظم کی تلقین کی جس کے پڑھنے کی برکت سے آپ نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ "اے ابراہیم! میرے برادر الیاس نے تمہیں اسمِ اعظم تعلیم کیا ہے یہ تمام برکتیں اسی کی ہیں۔" یہ بھی واضح رہے کہ جس طرح صوفیاء کے ہاں حضرت خضر علیہ السلام کو ایک زندہ جاوید ہستی تسلیم کر لیا گیا ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور مواظبت کرو گے تو تم پر اسرارِ باطنی کھل جائیں گے۔" پھر حضرت خضر علیہ السلام نے آپ کو وقوفِ عددی کی تعلیم دی اور فرمایا: "حوض میں غوطہ لگاؤ اور دل سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہو۔" چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور اس کا ورد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ پر اسرار و رموز منکشف ہونے لگے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۳۴)

پھر اسی بیان کی تصدیق یعقوب چرخی (م ۸۵۱ھ) کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اس کے بعد آپ (یعنی یعقوب چرخی کے پیر خواجہ بہاؤ الدین نقشبند م ۷۹۱ھ) نے اپنے مشائخ کا سلسلہ بیان کیا اور خواجہ عبد الخالق غجدوانی تک بیان کیا اور پھر مجھ کو وقوفِ عددی کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ علم لدنی کا پہلا سبق ہے اور یہ حضرت خضر علیہ السلام نے خواجہ غجدوانی کو بتایا تھا۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۹)

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا علم لدنی کا یہ پہلا سبق جو وقوفِ عددی سے تعلق رکھتا ہے اسرار و رموز کے انکشاف میں اتنا اہم ہے کہ اس سلسلہ میں یہ سبق متوارث چلا آ رہا ہے۔ یہ وقوفِ عددی ہے کیا بلا؟ اس کی تصریح تذکرہ نگار نے نہیں فرمائی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عمل کا کچھ نہ کچھ تعلق پانی کے حوض سے بھی ہے کیونکہ حضرت خضر کا پانی سے گہرا تعلق بتلایا جاتا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام سے روایت

پھر جو اولیاء اللہ حضرت خضر علیہ السلام یا ان کے واسطہ سے "ولایت" کی تعلیم پاتے ہیں۔ ان سے روایت بھی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً:

"حضرت خضر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جو کوئی اذان کے وقت اپنے ہاتھوں کے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کو آنکھوں پر پھیرے وہ درد چشم سے امن پائے جب مؤذن کہے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ"

(ریاض السالکین، ص ۳۲۷) (نیز دیکھئے کتاب ہذا ص ۲۲۴)

اگر آپ خود خضر بننا چاہتے ہیں تو اس کا نسخہ بھی حاضر خدمت ہے۔

خضر بننے کا طریقہ

"اگر مجموعہ اسمائے عظام کو اوقاتِ مذکورہ پر پچیس پچیس مرتبہ اور جمعہ کو پچھتر مرتبہ اسی وقت پڑھے اپنے وقت کا خضر ہوگا۔" (ریاض السالکین، ص ۳۴۰)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) اسی طرح حضرت الیاس ع کو بھی وہ زندہ جاوید تسلیم کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس طبقہ میں راہنمائی اور تعلیم کے لئے حضرت خضر علیہ السلام حضرت الیاس علیہ السلام سے بہت زیادہ مشہور و معروف ہیں۔ اس روایت میں حضرت خضر علیہ السلام کی زبانی حضرت الیاس علیہ السلام کی شخصیت اور تعلیمات سے بھی متعارف کرا دیا گیا ہے۔

ان اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کی تعلیم نقوش و عملیات سے رکھتی ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کسی مخصوص ہستی کا نام نہیں۔ بلکہ جو کوئی ان نقوش و عملیات کا ماہر ہو، وہی اپنے وقت کا خضر ہوتا ہے۔ اگر آپ اس طرح سے خضر بن جائیں تو نئے بننے والے ولیوں کی غائبانہ طور پر رہنمائی فرما سکتے ہیں اور غالباً یہ ولایت کا کوئی بلند درجہ ہے۔

۵۔ صرف صحبتِ بزرگان سے بننے والے ولی

صاحب "صوفیائے نقشبند" فرماتے ہیں کہ:

"آپ (خواجہ علی رامتینی م ۷۱۵ھ) اپنے مذہبِ حنفیہ کے پابند اور اپنے زمانہ کے قطب تھے جو شخص ایک روز آپ کی صحبت میں بیٹھ جاتا حقیقت اور معرفتِ الٰہی تک پہنچ جاتا۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۴۸)

ہمارے خیال میں ولایت کے حصول کا یہ طریقہ سب سے آسان ہے۔ وقت بھی بہت کم لگتا ہے۔ ہر طرح کے جھمیلوں سے بھی چھٹی مل جاتی ہے اور کچھ تکلیف بھی نہیں ہوتی۔

خواجہ ابو یوسف بن سمعان (م ۴۵۹ھ) "بعض مورخین نے لکھا ہے کہ جو شخص حضرت شیخ کی خدمت میں تین دن رہتا تھا صاحبِ کرامت ہو جاتا تھا۔ گویا اس سلسلہ میں سلسلہ چشت سے نقشبند بازی لے گئے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵)

۶۔ مجذوبین

صوفیاء ایسے اولیاؤں کے لئے جذب و سکر اور استغراق کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ظاہری حالت میں یہ لوگ بالکل دیوانوں طرح ہوتے ہیں۔ کیچڑ میں لیٹنا، گرمیوں میں دھوپ میں بیٹھے رہنا، برہنہ پھرنا، حواس باختہ ہونا یہ سب کچھ انہی لوگوں کی علامات ہیں۔ مجذوب کا مطلب یہ ہے کہ یا اللہ کی طرف سے اسے جذب ہو رہا ہے یا وہ خود اللہ کی ذات میں جذب ہو رہا ہے اور استغراق کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سے لو لگائے ہے۔ باقی دنیا جہان کی اسے کوئی خبر نہیں۔ صوفیاء کے نقطۂ نظر سے ایسے حضرات بھی

مقبول ولی اور مستجاب الدعوات ہوتے ہیں۔ رہا تکالیفِ شرعیہ کا معاملہ، تو ان سے اس کا تصور بھی محال ہوتا ہے بلکہ بعض عیار صوفی تکالیفِ شرعیہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے بھی سُکر و استغراق کی مصنوعی کیفیت پیدا کر لیتے ہیں۔

ایسا ولی بننے کے بھی دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ کسی "مُرشدِ کامل" کی نظرِ کیمیا اثر کے طفیل کوئی شخص مجذوب بن جائے جیسے:

عبدالرحمان قادری نوشاہی (م ۱۱۵۲ھ) المعروف رحمان پاکؒ

ان کا وطن موضع بھڑی ضلع گوجرانوالہ ہے

ابھی صرف پانچ برس کے تھے کہ ادھر نوشہ گنج بخش کا گزر ہوا۔ نوشاہ صاحب کی ان پر ایسی نظرِ کیمیا اثر پڑی کہ بے خودی اور جذب و مستی اسی عمر میں پیدا ہو گئی اور اپنے گاؤں میں رحمان دیوانہ مشہور ہو گئے۔ والدین نے ایسا بچہ نوشاہ صاحب کو ہی دے دیا۔ جنہوں نے ان کی ظاہری و باطنی تربیت بحدِ کمال کی۔ رحمان صاحب کا مجاہدہ اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ تمام رات بہ حبسِ دم، ذکرِ خفی کرتے اور بعض اوقات معکوس لٹک کر رات بھر ذکر میں مشغول رہتے۔ خلوت اختیار کرتے تو قبر کھدوا کر اس پر بیٹھ جاتے اور چالیس چالیس روز اسی حالت میں گزار دیتے۔ ساتھ ہی ساتھ ذوقِ سماع و وجد بھی بے انداز تھا۔ حالت سماع و وجد میں مدہوشی کا یہ عالم تھا کہ کبھی آپ اپنے آپ کو بیلوں کے پیچھے باندھ کر زمین پر گھسٹتے جاتے۔ گرمیوں کے موسم میں سورج میں بیٹھتے۔ سردیوں میں برہنہ تن رات کو جنگل میں جا بیٹھتے اور کبھی دریا میں کھڑے ہو کر ذکرِ حق میں مشغول ہوتے آپ کی گرمیٔ ذکر سے دریا کا پانی گرم ہو جاتا۔ جس شخص پر نظر ڈالتے وہ صاحب کشف و کرامت ہو جاتا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۰۵)

یہ ہیں ہمارے اولیاء اللہ جو خواہ کس قدر مدہوش ہوں۔ وجد و سماع پر پھر بھی ہوش میں آجانے اور مر مٹتے ہیں اور یہ دریا کے پانی کا ذکر سے گرم ہونے کا لطیفہ بھی خوب ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی جلد بے اثر ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ پانی صرف آپ ہی کے لئے گرم ہوتا تھا۔ دوسروں کے لئے آپ کی گرمیٔ ذکر کے باوجود وہ ٹھنڈے کا ٹھنڈا ہی ہوتا تھا۔ اب اگر ایسے لوگ بھی ایک ہی نظر سے دوسرں کو صاحبِ کشف بنانے لگیں۔ تو یہ دنیا اب تک کشف و کرامات سے بھرپور ہو جاتی۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ یہ نوشاہی حضرات جس کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ کسی ولی اللہ کا پس خوردہ کھا لیا جائے۔ تو اس قسم کی ولایت حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسے شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب اپنی تاریخ مشائخ چشت کے صفحہ ۱۶۲ پر خواجہ شریف زندنی (م ۶۱۲ھ) کے متعلق فرما رہے ہیں کہ: "اہلِ تاریخ نے لکھا ہے کہ حضرت کا پس خوردہ جو شخص کھا لیتا تھا، مجذوب ہو جاتا تھا۔"

بتلائیے اسلام کو ایسے اولیاء اللہ کی کچھ ضرورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی نظر کیمیا اثر نے کسی کو بھی مجذوب نہ بنایا۔ نہ ہی آپ کے پس خوردہ کھانے سے کوئی مجذوب بنا۔ پھر ان مجذوبوں کا کوئی بھی پہلو شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ہوتا ہے؟

۷۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک پہنچنے والے ولی

ایسے چند اولیاء اللہ کا ذکر ہم عشق و مستی کے بیان میں پہلے ذکر کر چکے ہیں ایسے اولیاء اللہ اپنا کام عشقِ مجازی سے شروع کرتے ہیں۔ پھر از خود عشقِ حقیقی کی منزل پر پہنچ کر ولی بن جاتے ہیں۔ پھر ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ولی تو پہلے سے ہوتے ہیں مگر عشق حقیقی کی منزل ادھوری سمجھ کر معاشقہ کے لئے کسی لونڈے کو پسند فرما لیتے ہیں۔ اس طرح یہ مسئلہ کہ "پہلی منزل مجازی عشق ہے یا حقیقی" لاینحل ہی رہ جاتا ہے۔

۸۔ پاخانہ کھانے سے بننے والے ولی

"ایک باباجی میں یہ کمال تھا کہ جو بات منہ سے نکالتا وہی ہو جاتی۔ راجہ نے اُس سے پُوچھا کہ "مہاراج (یعنی میر صاحب) آپ کو یہ کمال کیونکر حاصل ہوا؟" اس نے جواب دیا کہ: "میں بارہ برس سے اپنا پاخانہ، پیشاب کھاتا پیتا ہوں اس کی بدولت میری زبان میں یہ تاثیر ہے کہ ایک فقیر کو بادشاہ یا راجہ کہہ دوں، تو فوراً ہو جائے۔" راجہ نے کہا: "پھر آپ کو کیا؟ بادشاہ بنا تو دوسرا، راجہ ہوا تو اور، تمہاری قسمت میں تو وہی پاخانہ پیشاب۔" (تذکرہ غوثیہ، ص ۳۴۹، بحوالہ رضاخانی مذہب ۱۳۲)

اب آپ ہی بتلائیے کہ پاخانہ پیشاب کو شریعت نے حرام قرار نہیں دیا؟ اور کیا حرام خور ولی بن سکتا ہے۔ لیکن ولایت کی دُنیا بڑی وسیع ہے۔ اس میں حرام خوری بھی بلندیٔ درجات کا سبب بن سکتی ہے۔

WWW. RAHEHAQ.COM

۹۔ اولیاء اللہ کی انوکھی قسم ـــــ خدا کی بیوی

جناب احمد رضا خان بریلوی فرماتے ہیں:
"حضرت موسیٰ سہاگ مشہور بزرگ گزرے ہیں میں اُن کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں۔ زنانہ وضع رکھتے تھے۔ ایک بار شدید قحط پڑا۔ قاضی اکابر جمع ہو کر حضرت کے پاس دُعا کے لیے گئے۔ آپ انکار فرماتے رہے کہ میں کیا دُعا کے قابل ہوں۔ جب لوگوں کی التجاء وزاری حد سے گزری تو ایک پتھر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ کی چوڑیوں کی طرف لائے اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر فرمایا: مینہ بھیجئے یا اپنا سہاگ واپس لیجئے۔" سہاگن بیوی کا یہ کہنا تھا کہ گھٹائیں پہاڑ کی طرح اُمڈیں اور جل تھل ہوگیا۔" (ملفوظات احمد رضا خان، ص ۹۴، ج ۲ بحوالہ رضاخانی مذہب، ص ۲۰)

پھر اس میاں بیوی کے تعلق کی مزید تشریح جناب احمد رضا خان یوں فرماتے ہیں کہ:

"حضرت موسیٰ سہاگ ایک دن نمازِ جمعہ کے وقت بازار میں جا رہے تھے۔ اِدھر سے قاضیٔ شہر جامع مسجد کو جاتے تھے۔ انہیں دیکھ کر کہا کہ یہ وضع مردوں کو حرام ہے۔ مردانہ لباس پہنیئے اور نماز کو چلیئے اس پر انکار و مقابلہ نہ کیا۔ چوڑیاں، زیور اور زنانہ لباس اتارا اور مسجد کو ساتھ ہولئے۔ خطبہ سنا۔ جب جماعت قائم ہوئی اور امام نے تکبیرِ تحریمہ کہی اللہ اکبر سنتے ہی اُن کی حالت بدلی۔ فرمایا "اللہ اکبر! میرا خاوند حیٌّ لایموت ہے کہ کبھی نہ مرے گا اور یہ مجھے بیوہ کئے دیتے ہیں۔ اتنا کہنا تھا کہ سر سے پاؤں تک وہی سُرخ لباس تھا اور وہی چوڑیاں۔" (حوالہ ایضاً)

اس اقتباس کے آخری جملہ کو جناب احمد رضا خان نے نامکمل ہی چھوڑ دیا کہ آیا "وہی سرخ لباس اور وہی چوڑیاں" وہ تھیں جو موسیٰ سہاگ نے پہلے اتار کر اپنے پاس رکھ لی تھیں، وہی پہن لیں یا وہ الگ ہی رکھی رہیں۔ اور پردۂ غیب سے ایسا ہی سُرخ لباس اور چوڑیاں نمودار ہوکر موسےٰ سہاگ کے زیب تن ہوگئی تھیں۔

یہ اللہ کی بیوی سُرخ لباس پہنتی اور زیور اور چوڑیاں پہنتی تھی اور نماز کے نزدیک تک نہ جاتی تھی۔ کیونکہ نماز ادا کرنے سے اس کا سہاگ چھن جاتا اور وہ بیوہ ہوجاتی تھی اور زبان سے علی الاعلان کہتی تھی کہ اللہ حیٌّ لا یموت میرا خاوند ہے جبکہ خاوند میاں یا اللہ تعالیٰ کو موسیٰ سہاگ کو بیوی بنانے سے شدید انکار ہے۔ وہ تو فرماتا ہے " وَلَمْ تَكُنْ لَّهُ صَاحِبَةٌ (۶:۱۰۲) اس کی کوئی بیوی نہیں۔ اور ایسا خیال کرنا بھی صریح کفر اور شرک ہے۔ شاید اس دنیائے طریقت میں یہ سب کچھ جائز ہے۔ سبحانہٗ و تعالیٰ عمّا یصفون۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان مختلف طریقوں سے بننے والے اولیاء اللہ کی تکمیلِ ولایت کا معیار کیا ہے؟ تو اس سلسلہ میں اکابر صوفیاء میں بہت اختلاف واقع ہوا اور وہ کسی ایک معیار پر متفق نہیں ہو سکے لہٰذا اب ذیل میں مختلف اکابرین کا معیار پیش کرتے ہیں:

۴۔ تکمیلِ ولایت کا معیار

۱۔ امام باقر (م ۱۱۴ھ) کا معیار

"ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا: "مجھے بتلایئے مومن کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟" فرمایا: "مومن کا حق یہ ہے کہ اگر وہ اس کھجور کے درخت کو کہے کہ اِدھر آؤ، تو وہ درخت توقف نہ کرے۔" یہ بات سنتے ہی کھجور کا وہ درخت چل کر آپ کے پاس آگیا، تو آپ نے کہا: "درخت! میں نے تو یہ بات بر سبیل تذکرہ کہی تھی۔ تم اپنی جگہ پر چلے جاؤ۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۸۲)

یہ روایت بھی بلا سند لہٰذا غلط ہے اور اس کے غلط ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے پوچھا، معاذ! کیا تو جانتا ہے کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟" حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: "اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اُسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر حق یہ ہے کہ وہ ان کو عذاب نہ کرے اِلّا یہ کہ کسی نے اس کے ساتھ شرک کیا ہو۔" (متفق علیہ، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الایمان، الفصل الاول)

بات دراصل یہ ہے کہ ایسی روایات جن سے کرامات کا ثبوت مہیا ہو۔ بعد میں آنے والے صوفیوں نے گھڑ کر پہلے بزرگوں سے منسوب کر دیں جیسا کہ ابُونعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) نے حلیۃ الاولیاء کی تصنیف کے دوران کیا۔ البتہ اتنی احتیاط ضرور کی گئی ہے کہ تکمیلِ ولایت کے بجائے "اللہ پر حق" کے الفاظ سے سوال کیا ہے۔ ورنہ بات ایک ہی ہے۔

اور وہ درخت بھی کچھ زیادہ ہی فرمانبردار تھا جو بر سبیلِ تذکرہ بات کرنے پر بھی دوڑا آیا اور امید ہے کہ وہ واپسی کے آرڈر پر واپس تو ضرور چلا ہی گیا ہوگا۔

۲۔ ابراہیم بن ادھم (م ۱۶۲ھ) کا معیار

آپ ایک مرتبہ جبلِ ابوقبیس پر تشریف فرما تھے۔ تذکرۃً فرمایا کہ بعض اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ پہاڑ کو اگر کہیں چل تو وہ چلنے لگتا ہے۔ یہ فرماتے ہی پہاڑ کو جنبش ہونے لگی۔ آپ نے فرمایا: "ٹھہر جا میں تو قصہ بیان کر رہا تھا۔" وہ ٹھہر گیا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۳۹)

یہ معیار بھی بہت حد تک امام باقر کے معیار سے ملتا جلتا ہے اور روایت بھی۔"

۳۔ شیخ علی خواص کا معیار

"عبدالوہاب شعرانی (م ۹۷۳ھ) فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے شیخ علی خواص کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ "ہمارے نزدیک مردِ کامل اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے مُرید کی حرکاتِ غیبی کو روزِ میثاق سے لے کر اس کے جنت یا دوزخ میں داخل ہونے تک نہ جان لے۔" دکبریت احمر بحاشیہ الیواقیت والجواہر، بحوالہ سیرۃ غوث، ص ۱۶۵)

۴۔ شیخ شبلی (م ۳۳۴ھ) کا معیار

"شیخ شبلی فرماتے ہیں کہ" اگر ایک سیاہ چیونٹی، اندھیری رات میں سخت پتھر پر چل رہی ہو اور میں اُس کی آواز نہیں سنتا، تو میں خیال کرتا ہوں کہ میں فریب میں آگیا۔"

" اور ایک اور بزرگ نے فرمایا ہے کہ" نہ میں یہ بات کہتا ہوں جو شبلی نے کہی اور نہ اس کو سمجھتا ہوں اس لئے کہ وہ (چیونٹی) حرکت کرنے کے لیئے بھی تیار نہیں ہے مگر میری قدرت کے ساتھ۔ اور میں اُس کا محرک ہوں۔ پھر میں کس طرح کہوں کہ میں اس کو نہیں جانتا۔" (انسانِ کامل، ص ۲۰۴)

اب دیکھئے کہ یہ "ایک اور بزرگ" تو شیخ شبلی کے بھی استاد نکلے۔ شیخ شبلی نے تو صرف علمِ غیب کُلی کا دعویٰ فرمایا تھا۔ اس بزرگ نے ساتھ ہی ساتھ اسی قدر تصرف کا دعویٰ بھی فرما دیا۔ شبلی کے نزدیک تکمیلِ ولایت کا معیار وہ تھا۔ اس "ایک اور بزرگ" کے نزدیک یہ ہے۔

۵۔ معین الدین اجمیری (م ۶۳۲ھ) کا معیار

"کسی نے آپ سے پوچھا: "مرید ثابت قدم کب ہوتا ہے؟" آپ نے فرمایا کہ "جب فرشتہ بیس سال تک کوئی بُرائی اس کے نامۂ اعمال میں نہ لکھے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۷۰)

غور کیجئے! ثابت قدمی کا کتنا کڑا معیار آپ نے مقرر فرما دیا۔ جس پر پورا اترنا ناممکنات سے ہے جبکہ حضور اکرم ﷺ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (۴۸/۲) تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے۔

لیکن اجمیری صاحب کے ثابت قدم مریدوں کی شان یہ ہے پھر اجمیری صاحب کی اپنی شان تو بہرحال ان سے بھی بلند ہی ہونی چاہئے۔

۲۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۳۴ھ) کا معیار

"آپ سے پوچھا گیا کہ حضرت کیونکر معلوم ہو کہ اب سلوک کا مرتبہ تمام ہو گیا اور یہ شیخ کمال کو پہنچ گیا، فرمایا: "اگر وہ کسی مُردہ پر دَم کر دے اور وہ مُردہ خدا کے حکم سے زندہ ہو جائے تو اس وقت سمجھ لو کہ وہ کمالیت کو پہنچ گیا۔" اتنے میں ایک ہندو عورت روتی ہوئی آئی اور قدموں میں سر رکھ دیا اور کہا کہ "میرا ایک ہی بچہ تھا جسے بادشاہ نے بیگناہ دار پر کھنچوادیا۔" آپ اپنے اصحاب کے ساتھ عصا ہاتھ میں لئے وہاں پہنچے اور فرمایا: "الٰہی! اگر اسے بادشاہ نے بے گناہ دار پر کھینچا ہے تو اسے زندہ کر دے۔" آپ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ لڑکا زندہ ہو کر ساتھ چلنے لگا۔ یہ کرامت دیکھ کر کئی ہزار ہندو مسلمان ہو گئے پھر آپ نے اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا کہ "مرد کی کمالیت اس سے زیادہ نہیں ہے۔"

(ملفوظات خواجہ فریدالدین، ص ۱۱۰، ۱۱۱، مرتبہ بدر اسحٰق۔ ترجمہ غلام احمد بریاں)

۳۔ تکمیلِ ولایت کا انوکھا معیار

"عارف کی پہچان ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ عورتوں کے اندامِ مخصوصہ کو ہر وقت نظر رکھتا ہو"۔۔۔ یعقوب فرماتے ہیں کہ وہ مردِ کامل پر اس حمل کی حالت پر مطلع ہوتا ہے جو ابھی تک ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے (یعنی) کسی عورت کو حمل قرار نہیں پاتا، مگر وہ اُسے جانتا ہے۔" (نجم الرحمان، ص ۱۰۴، ۱۰۶)

"لا تستقر نطفة فی فرج انثیٰ الا ینظر ذٰلک الرجل (الکامل) الیہا (نجم الرحمان، ص ۱۱۱، بحوالہ رضا خانی مذہب، ص ۱۴۰) کسی مادہ کی شرمگاہ میں کوئی نطفہ قرار نہیں پاتا مگر وہ کامل مرد اس کو دیکھتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے سات مشہور و معروف اولیاء اللہ کا تکمیلِ ولایت سے متعلق قائم کردہ معیار بیان کر دیا ہے۔ اب یہ سب معیار کسی "بہت بڑی کرامت" سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب اگر کچھ بزرگ زبان سے یہ کہتے بھی جائیں کہ کرامت و ولایت لازم و ملزوم نہیں تو ان بیانات کے سامنے ان کے اس زبانی دعوے

کی کچھ حقیقت رہ جاتی ہے؟

۵۔ اولیاء اللہ اور کیمیا گری

اولیاء اللہ کے تذکرے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کیمیا گری کا فن بھی آتا تھا۔ ان میں سے بعض حضرات تو اسے بطور علم و فن جانتے تھے اور بعض بطور کرامت وقت آنے پر سونا بنا دیا کرتے تھے۔ چند اولیاء اللہ کے واقعات حاضر خدمت ہیں:

۱۔ شیخ نظام الدین عمری (م ۱۰۳۴ھ)

"آپ کو علوم اسرار و رموز کے علاوہ کیمیا وغیرہ کے علوم بھی حاصل تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ علوم ظاہری آپ نے پڑھا ہی نہیں تھا۔ بلاتحصیل ہی کمال حاصل تھا۔ آپ جس شخص پر نظر فرماتے ایک ہی دلہ میں صاحب شہود ہو جاتا تھا اسی وجہ سے بہت لوگوں نے "ولی تراش" نام رکھ دیا تھا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا۔ ص ۲۱۵)

۲۔ میاں نتھا قادری (م ۱۰۲۷ھ)

شہزادہ محمد دارا شکوہ اپنی کتاب سکینۃ الاولیاء میں رقمطراز ہیں کہ نباتات اور جمادات تک میاں نتھا قادری (م ۱۰۲۷ھ۔ یہ میاں میر لاہوری کے خاص الخاص مرید تھے) سے ہم سخن ہوتے تھے۔ ایک روز میاں نتھا جنگل میں جا رہے تھے کہ ایک درخت سے آواز آئی کہ "اگر قلعی کو چرخ دے کر اس پر میرے پتے ڈالے جائیں تو وہ چاندی ہو جائے گی۔ میاں نتھا نے یہ سُن کر کوئی جواب نہ دیا۔ آگے بڑھے تو دوسرے درخت سے آواز آئی۔ "اگر تانبا کو چرخ دے کر میری تھوڑی سی لکڑی اس میں ڈالی جائے، تو وہ زر خالص بن جائے گا۔" میاں نتھا اس پر بھی متوجہ نہ ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۳۱)

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو پہلے ہی یہ معلومات حاصل تھیں کہ اس پر متوجہ بھی نہ ہوئے یا پھر یہ کرامت آپ کی رفعتِ شان کے لحاظ سے حقیر اور کمتر تھی۔

۳۔ عبداللہ بلوچ (م ۱۰۴۲ھ)

"شیخ عبداللہ بلوچ قادری (م ۱۲۱۲) کی خدمت میں ایک ہندو آیا۔ عرض کیا" میں علم کیمیا کا شائق ہوں۔ بڑی محنت اور روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ معلوم نہیں کہ آیا یہ بھی کوئی علم ہے یا نہیں۔ اگر آپ

اس معاملے میں میری رہنمائی فرمائیں، تو ممنون ہوں گا۔" آپ نے فرمایا: "بہتر، جاؤ کچھ تانبے کے پیسے، سمّ الفار اور گندھک لے آؤ۔" وہ ہندو اسی وقت بازار جا کر یہ چیزیں لے آیا۔ آپ نے فرمایا کہ: "جس مٹی کے پیالے میں ہم کھانا کھاتے ہیں وہ اٹھا لاؤ اور تانبے کے پیسے اس میں ڈال کر سمّ الفار اور گندھک بھی اس میں شامل کر دو۔ اوپر کوئلے بھر کر آگ دے دو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دیر کے بعد فرمایا: "چمٹے سے اسے پکڑ کر ایک پیسہ باہر نکالو۔" میں نے ایک پیسہ نکال کر زمین پر رکھ دیا۔ اس ہندو سے فرمایا "اسے کوٹو جب سیاہ پردہ دُور ہو گیا تو زرِ خالص نکل آیا۔ وہ ہندو اسی وقت حلقہ بگوش اسلام ہو کر آپ کا مُرید ہو گیا۔"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۱۹)

ایسے تجربے تو سب مہوسی تمام عُمر کرتے ہی رہتے ہیں اور وہ ہندو بھی کرتا رہا ہو گا لیکن سونا نہ بن سکا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کے کھانے کے مٹی کے پیالہ کی کرامت تھی۔ شاید مُرید ہونے کے بعد اس کے اپنے کھانا کھانے کے مٹی کے پیالہ میں بھی یہ کرامت پیدا ہو گئی ہو۔

۴۔ شاہ بلاول (م ۱۰۴۶ھ)

"صاحب محبوب الواصلین لکھتے ہیں کہ محلہ شیخ ابواسحٰق میں آپ (شاہ بلاول قادری لاہوری م ۱۰۴۶ھ) کے ایک ہمسایہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور رسم کے مطابق نقال زرِ مبارک باد لینے آئے۔ وہ بڑا تنگ دست اور مفلس تھا۔ آپ اس کے حال سے واقف تھے۔ آپ ایک مٹی کا لوٹا لے کر حجرے سے باہر آئے اور اسے دیوارِ ہمسایہ پر مار کر توڑ ڈالا۔ تمام ٹکڑے زرِ خالص بن گئے۔ جنہیں نقال اٹھا کر لے گئے اور ہمسایہ کو ان سے خلاصی ہوئی۔"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۴۵)

ہمارے خیال میں اگر آپ یہ لوٹا دیوار کی اندرونی جانب توڑتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اس بیچارے مفلس کا افلاس بھی ختم ہو جاتا اور وہ بھانڈوں کو بقدرِ ضرورت زرِ مبارک باد دے کر خود بطریقِ احسن رخصت کر سکتا۔

۵۔ میاں جی نور محمد (م ۱۲۵۹ھ)

ایک سادھو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رخصت ہوتے وقت کہنے لگا: "میری زنبیل میں تھوڑی سی اکسیر ہے یہ لے لے۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے پاس روپے پیسے کی کمی ہے۔" آپ نے انکار کر دیا جب اس نے دو تین بار اصرار کیا، تو آپ نے ایک ڈھیلا اٹھا کر سامنے کی دیوار پر مارا اور اسے کہا کہ سامنے دیکھ۔

اس نے دیکھا تو ساری دیوار سونے کی ہوگئی تھی۔ یہ دیکھ کر کہنے لگا "تب تو میاں جی تجھے اس کی ضرورت نہیں۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۲۳۸)

معلوم ہوتا ہے کہ سادھو کے جانے کے بعد وہ دیوار پھر اپنی اصلی حالت پر آگئی تھی اور اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی، جیسے قرآن میں آیا ہے:

وَسَحَرُوٓا اَعۡیُنَ النَّاسِ وَ اسۡتَرۡهَبُوۡهُمۡ۔ اور ان (فرعونی ساحروں نے) لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور وہ ڈر بھی گئے تھے۔

اگر وہ دیوار علیٰ حالہٖ قائم رہتی تو کیا اچھا تھا۔ سینکڑوں من سونا پورے ملک سے افلاس کو دور کرنے میں بہت ممد ثابت ہوتا اور تاریخوں میں اس کا ذکر ہوتا۔

۷۔ توکل شاہ انبالوی (م ۱۳۱۵ھ) اور سونے چاندی کی نہریں

"مولوی محبوب روایت کرتے ہیں کہ میرے سامنے ایک فقیر آپ کی خدمت میں آیا اور کہا: "مجھے سونا بنانا سکھلا دیجئے۔" آپ یہ سن کر جوش میں آگئے اور اسے اپنے حجرہ میں لے گئے اور بڑی دیر کے بعد حتیٰ کہ نماز ظہر کا وقت بھی آخر ہوگیا، باہر تشریف لائے۔ میں نے اس فقیر کو مسجد میں لے جا کر دریافت کیا کہ "تجھ پر کیا گزری؟" اس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور محویت کا عالم طاری تھا۔ اس نے بتایا کہ "مجھ کو حجرہ میں لے جا کر جانماز کے نیچے میرا سر دے دیا۔ میں نے دیکھا کہ سونے، چاندی اور جواہرات کی نہریں جاری ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے کہا کیا حال ہے؟" پھر فرمایا: "آگے چل کر دیکھو کہ نہریں کہاں سے آ رہی ہیں۔" اور مجھے ایک دھکا اور دے دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جگہ پہ ایک نوری تختہ پر لفظ "اللہ" لکھا ہوا ہے اور اس کے ہر ایک حرف سے ایک نہر جاری ہے۔ فرمایا: "دیکھ لے اس سے کیمیا آتی ہے۔" اور پھر میرے قلب پر لفظ اللہ لکھ کر مجھ کو توجہ دی۔ اب میرے جسم کے جوڑ جوڑ سے اللہ اللہ جاری ہے۔" وہ ایسی حالت میں جنگل کو چلا گیا۔ کیمیا کی خواہش اُس کے دل سے محو ہوگئی اور خدا کے نام میں محو ہوگیا۔"

(صوفیائے نقشبند، ص ۲۵۶)

۱۔ اب دیکھئے جنت میں ستھرے پانی، دودھ، شہد اور شراب خالص کی نہروں کا ذکر قرآن و حدیث میں بھی آیا ہے لیکن یہ سب سیال چیزیں ہیں۔ ان کی تو نہریں بہہ سکتی ہیں لیکن سونا، چاندی اور جواہرات ٹھوس چیزیں ہیں۔ اگر شاہ صاحب ان چیزوں کی کانیں دکھلا دیتے تو روایت ذرا معتبر ہو جاتی۔

۲۔ دھاتیں بھی شدت کی گرمی سے پگھل کر بہنے لگتی ہیں۔ لیکن اس حالت میں ان سب کا رنگ ایک ہی جیسا آگ کی مانند سُرخ ہو جاتا ہے اور یہ تمیز نہیں رہتی کہ یہ سونے کی نہر ہے اور یہ چاندی کی اور یہ جواہرات کی۔

۳ "اللہ" کے حرف چار ہیں، لیکن نہریں آپ نے صرف تین جاری کیں۔ ایک اور بھی کر دیتے تو کیا مضائقہ تھا۔

بہرحال نتیجتہً یہ حکایت اچھی ہے۔ اچھا ہوا کہ وہ فقیر بے چارہ ساری عمر کیمیا گری میں برباد کرنے کی بجائے خدا کے نام میں محو ہو گیا اور جنگلوں کی راہ لی۔

۷ محمد بن اسلم طوسی اور سونے کا تراشہ

"نقل ہے کہ آپ ان درویشوں کی خدمت، جو آپ کے پاس آتے تھے قرض لے کر کرتے۔ ایک بار ایک یہودی جس کے آپ مقروض تھے آیا اور اپنی رقم طلب کی۔ آپ نے فرمایا: "اس وقت اس تراشہ قلم کے سوا کچھ نہیں، اسے اٹھا لے۔" اس نے جو ہاتھ لگایا، تو وہ خالص سونا تھا۔ اس نے اسی وقت کلمہ پڑھا اور کہا: یقیناً وہ دین برحق ہے جس میں اس شان کے بزرگ موجود ہیں، جن کے قلم کا تراشہ سونا ہو جاتے۔" (مقربانِ حق، ص ۱۸۴)

حضور اکرم ﷺ بھی درویشوں کی خدمت کے لئے اکثر یہودیوں سے قرض لیتے تھے۔ پھر ایک دن ایک یہودی نے مسجدِ نبوی ﷺ میں آکر شدید تقاضا کیا اور سخت سُست باتیں بھی کہیں، مگر حضور اکرم ﷺ نے معذرت چاہی اور ادائیگی کا وعدہ کیا۔ آپ سے ایسی "کرامت" صادر نہ ہو سکی۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ "بزرگ" ایسے باکرامت تھے تو انہیں یہودیوں سے قرض لینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ پہلے ہی تراشے کا سونا بنا لیتے۔ پھر ان صوفیاء کا ایک مخصوص مسئلہ اکلِ حلال میں کمال احتیاط کا بھی ہے تو کیا یہ بزرگ یہودیوں سے جو پیسہ لے کر درویشوں کو کھلاتے تھے، وہ اُن کے معیارِ حلت پر پُورا اُتر آتا تھا۔

۸ طلائی دیناروں کی بارش

منقول ہے کہ درویشوں کی ایک جماعت خواجہ عبدالواحد بن زید کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور بھوک کی وجہ سے بے قرار تھی۔ سب نے اتفاق کر کے آپ سے حلوا کی درخواست کی۔ پہلے تو آپ نے اس طرف توجہ نہ کی، لیکن جب اُن کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو آپ نے آسمان کی جانب منہ کر کے درخواست کی۔ فوراً طلائی دینار برسنے لگے۔ آپ نے درویشوں سے کہا کہ ان دیناروں میں سے صرف اتنا ہی لے لو جس سے حلوا بقدر کفاف تیار ہو سکے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، لیکن خواجہ نے اس حلوا میں سے کچھ نہیں کھایا۔ (سیرُ الاولیاء، ص ۳۸)

خواجہ صاحب نے آسمان سے گرے ہوئے طلائی دیناروں پر ضرورت سے زیادہ اٹھانے پر پابندی لگا دی۔ باقی دینار تو ضائع ہی ہوگئے ہوں گے۔ کیا اس سے بہتر یہ نہ تھا کہ طلائی دیناروں کے بجائے بقدرِ ضرورت حلوے کی ہی بارش ہو جاتی۔ جب کوئی خرقِ عادت واقعہ ہونا ہی ہے، تو حلوا اُترنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ پھر لُطف کی بات یہ ہے کہ آپ نے حلال و طیّب حلوا میں سے خود کچھ بھی نہیں کھایا۔

اور ابراہیم بن ادھم کا وہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی لوہے کی سوئی دریا میں گرائی تو ہزارہا مچھلیاں سونے کی ایسی سوئیاں لے کر آپ کے پاس حاضر ہوگئیں، لیکن خواجہ محمد چشتی (م ۱۱۴ھ) غالباً ابراہیم بن ادھم سے زیادہ باکرامت بزرگ تھے۔ کیونکہ ان کے لئے دجلہ کی مچھلیاں سونے کی سوئیوں کے بجائے طلائی دینار منہ میں لئے اُبل پڑی تھیں۔ (سیر الاولیاء، ص ۴۷)

۶۔ صوفیاء کا اشاعتِ اسلام کا طریقہ

انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہی رہا ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اور اس کی تبلیغ واشاعت کریں اور ہوتا یہ رہا ہے کہ جب کسی نبی نے اپنی قوم کو دعوت دی تو قوم نے انبیاء کو جھٹلا دیا۔ بعض قوموں نے انبیاء سے معجزات کا مطالبہ کیا، لیکن معجزات دیکھنے کے بعد اس معجزہ کو "جادو" قرار دے کر انبیاء کی دعوت کو مسترد کر دیا اور انبیاء کو جھٹلایا۔ ارشاد باری ہے:

وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (۲/۵۴)	اور کافر جب بھی کوئی نشانی دیکھتے ہیں، تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے چلا آتا۔

انبیاء پر صرف وہ لوگ ایمان لاتے رہے جو اُن کی پاکیزہ زندگی اور اخلاق و کردار سے متاثر ہوئے۔ معجزات کے طالب کم ہی ایمان لائے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے سانپ بن کر ساحروں کی رسّیوں کو کھا جانے پر صرف جادوگر ہی ایمان لائے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جادوگر بحیثیت فن دان یہ سمجھ گئے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ جادو کے فن سے کوئی ماوراء چیز ہے۔ قومِ فرعون سے ایک آدمی بھی یہ معجزہ دیکھ کر ایمان نہ لایا۔

لیکن ہمارے اولیاء اللہ کی دنیا ہی الگ ہے۔ ان کا طریق کار یہ ہے کہ یہ اسلام کی تعلیمات پیش نہیں

فرماتے۔ بلکہ طلب کیے بغیر کوئی نہ کوئی کرامت پیش کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کافر دھڑا دھڑ اسلام لانا شروع کر دیتے ہیں۔ اب ان کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور صلوٰۃِ خمسہ

"راحت القلوب میں لکھا ہے کہ ایک دن مدینہ کے بازار میں چند یہودی بیٹھے تھے۔ ایک مسلمان سائل اُن کے پاس آیا اور کہا: "میں بھوکا ہوں، کھانے کو کچھ دیجئے۔" انہوں نے ازراہِ تمسخر کہا: "علی شاہِ مرداں کے پاس جاؤ، جو چاہو گے پاؤ گے۔" ابھی سائل نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ دُور سے حضرت علی رضی اللہ عنہ آتے دکھائی دیئے۔ وہ سائل اُن کے پاس گیا، اپنی داستانِ غم بھی بیان کی اور یہودیوں کے طعنہ کا بھی ذکر کیا۔ اتفاق سے اُس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ نہ تھا۔ آپ نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور پانچ بار صلوٰۃ خمسہ پڑھی اور سائل کے ہاتھ پر دم کر دیا اور پنجہ بند کر دیا اور کہا: "جاؤ یہودیوں کو دکھلاؤ۔" وہ اسی طرح پنجہ بند کئے یہودیوں کے پاس گیا۔ جب کھولا، تو اس میں سونے کے پانچ دینار تھے۔ حیران ہو کر دوڑے دوڑے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہو گئے اور مسلمان ہو کر ہدایت یافتہ ہو گئے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۶۷)

اب دیکھئے راحت القلوب کی اس روایت میں درج ذیل اُمور قابلِ غور ہیں:

۱۔ دورِ نبوی ـــــ میں ہی یہودیوں کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔

۲۔ دورِ عثمانی ـــــ میں مسلمانوں کے پاس اتنی دولت آگئی تھی کہ کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ ملتا تھا۔ کسی مسلمان کے مفلوک الحال ہونے کی وجہ سے سائل ہونا ہی خارج از بحث تھا۔

۳۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پانچ بار صلوٰۃِ خمسہ پڑھی تو پانچ دینار نکلے اگر دس بار پڑھتے تو یقیناً دس دینار نکلتے۔

۴۔ یہ صلوٰۃِ خمسہ کیا بلا ہے؟ کب ایجاد ہوئی؟ اس کی صاحب راحت القلوب نے تصریح نہیں فرمائی بہر حال اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی دَم جھاڑ اور جنتر منتر قسم کی کوئی چیز ہوگی، جو اس دورِ صحابہ سے بہت بعد کی پیداوار ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام جڑ دی گئی ہے۔

یہ بات بہر حال شک و شبہ سے بالا ہے کہ وہ سارے یہودی یہ کرامت دیکھ کر مسلمان ہو گئے تھے۔

اب اسی قسم کی چند کرامات جنہیں دیکھنے پر لوگ اسلام لاتے رہے۔ بلا تبصرہ حاضرِ خدمت ہیں:

۲۔ خواجہ حذیفہ المرعشی (م ۲۰۲ھ) اور ندائے غیب

"آپ سے کسی نے پوچھا: آپ اتنا کیوں روتے ہیں؟" فرمایا مجھے فَفَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ رُلاتا ہے۔ نہ معلوم میں کون سے فریق سے ہوں۔" اس نے کہا: "اگر ایسی بات ہے تو آپ بیعت کیوں لیتے ہیں؟" آپ نے یہ سن کر ایک آہ کھینچی اور بیہوش ہوگئے۔ جب ہوش میں آئے تو غیب سے بشارتِ جنت کی ندا آئی، جو سب نے سنی۔ کہتے ہیں کہ اس آواز پر تین سو کافران کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۴۶)

۳۔ خواجہ ابُواحمد ابدال چشتی (م ۳۵۷)

"ایک مرتبہ دورانِ سفر آپ کا گزر ایک کافروں کی بستی پر ہوا۔ جہاں قرب و جوار میں بھی کوئی مسلمان نہ تھا۔ اِن کافروں کی عادت تھی کہ جب کوئی مسلمان اُدھر کو آجاتا تو اس کو نہایت مار پیٹ کر آگ میں جلا دیا کرتے۔ اسی طرح حضرت شیخ کے ساتھ بھی معاملہ کیا مگر رُعب کی وجہ سے آگ میں ڈالنے کی جرأت نہ ہوئی شیخ نے کہا کہ تم فکر نہ کرو۔ میں خود ہی آگ میں گر جاؤں گا۔ یہ کہہ کر حضرت شیخ اپنا مصلیٰ آگ پر ڈال کر خود چلے گئے۔ حضرت کا وہاں پہنچنا تھا کہ آگ دفعتہً ٹھنڈی ہوگئی۔ یہ قصہ دیکھ کر سب متحیر ہوگئے۔ دل وجان سے قربان ہوگئے اور سینکڑوں نے فوراً اسلام قبول کرلیا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۴)

اب دیکھیے کہ:

۱۔ حضرت شیخ کا رُعب بھی نرالا تھا کہ مار پٹائی کے وقت تو کچھ اثر نہ دکھایا مگر جلانے کے وقت سب کافر مرعوب ہوگئے۔

۲۔ پھر جب رُعب کی وجہ سے کافروں کو آگ میں ڈالنے کی جرأت ہی نہ ہوسکی، تو پھر از خود آگ میں پڑنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔؟

۳۔ تاہم آپ نے آگ پر مصلے ڈالا اور خود مصلے پر ہی بیٹھ گئے ہوں گے ورنہ مصلّی کا کچھ مصرف نظر نہیں آتا، تو مصلے کی برکت کی وجہ سے نیچے سے آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ اور آپ مصلے سمیت زمین پر آگئے ہوں گے۔ یہ ایسی ترکیب ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذہن میں بھی نہ آئی تھی۔

۴۔ جو کچھ بھی ہوا بہر حال سینکڑوں کافر ضرور مسلمان ہوگئے تھے اور یہ ایسی سعادت ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی نصیب نہ ہوئی۔

۴۔ خواجہ محمد بن احمد (م ۴۱۱ھ)

"مادر زاد ولی تھے۔ حمل کے زمانہ میں والدہ کے پیٹ سے ذکر اللہ کی آواز آتی تھی۔ پیدا ہوتے ہی سات مرتبہ کلمہ پڑھا۔ ایام رضاعت میں مشغول بذکر رہتے تھے اور پانچوں وقت (یعنی نمازوں کے وقت) آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر ان گنت کلمہ پڑھتے۔ جو شخص آزمانے آتا وہی مسلمان ہو جاتا۔" (ایضا، ص ۱۵۵)

گویا جو لوگ آزمانے گئے تھے وہ سب کافر ہی ہوتے تھے اور یہ بات ہے بھی دل لگتی۔ بھلا جو لوگ پہلے ہی مسلمان ہوں اُن کو ایسی شنید پر کیسے شک ہو سکتا تھا ؟

۵۔ احمد خضرویہ کی کرامت

"احمد خضرویہ کے ہاں ایک درویش مہمان ہوئے۔ اس درویش کے ساتھ ستر اور بھی درویش تھے۔ آپ نے بطورِ مہمان نوازی ستر شمعیں روشن کیں اور وہ شمعیں ایسی تھیں کہ پھونک تو درکنار، اوپر خاک ڈالنے سے بھی نہ بجھتی تھیں آپ کی اس کرامت کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے دن جب آپ اس مہمان درویش کے ساتھ ایک راہب کے پاس سے گزرے، تو وہ اپنے گھر کے ستر آدمیوں سمیت مسلمان ہو گیا۔ آپ نے اپنے ساتھی درویش سے فرمایا "میں نے خدا کے لئے ستر شمعیں روشن کی تھیں۔ خدا نے میرے ہاتھ ستر گمراہوں کے دلوں کو نورِ ایمان سے روشن کر دیا۔" (مقربانِ حق، ص ۱۸۰)

راہب تو تارک الدنیا ہوتے ہیں۔ وہ راہب بھی خوب تھا، جو اپنے گھر کے ستر آدمیوں کے ساتھ ہی رہتا تھا۔

۶۔ سید مودود چشتی (م ۵۲۷ھ) کا جنازہ اُڑنا

"آپ کی وفات ۹۷ سال کی عمر میں رجب ۵۲۷ھ میں ہوئی۔ آپ کی نمازِ جنازہ اول رجال الغیب نے پڑھی۔ پھر عام آدمیوں نے اور نماز کے بعد جنازہ خود بخود اڑنے لگا۔ خواجہ صاحب کی اس کرامت سے بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۶۰)

اور سیر الاولیاء صفحہ ۴۹ پر یوں لکھا ہے کہ: "خواجہ کی یہ کرامت دیکھ کر اس دن ہزاروں کافر مسلمان ہو گئے۔"

۷۔ خواجہ عثمان ہارونی (م ۶۰۳ھ) کا آگ میں داخل ہونا

"ایک دفعہ آپ کا آتش پرستوں پر گزر ہوا۔ انہیں نصیحت فرمائی کہ آگ ہرگز

پرستش کے قابل نہیں۔ یہ تو خود مخلوق ہے۔ اگر اس کی پرستش کروگے تو بھی تم کو جلانے میں کمی نہیں کرے گی۔ پھر قیامت کے دِن بھی جلائے گی اور اگر اللہ کی پرستش کروگے تو آگ تمہیں قیامت کے دِن نہیں جلائے گی انہوں نے کہا: "اچھا تم جو اللہ کو پوجتے ہو۔ اس میں داخل ہو کر دکھلاؤ کہ وہ اثر کرتی ہے یا نہیں۔ آپ نے وضو کرکے دوگانہ ادا کیا۔ پھر سردار کے ایک کمسن بچے کو گود میں لے کر اس آگ میں چلے گئے اور دو گھنٹہ اس میں رہے۔ آگ نے اس بچہ پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس پر وہ سب آتش پرست مع سردار کے مسلمان ہو گئے۔"

(تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۲۴)

۸۔ معین الدین چشتی (۵۳۷ - ۶۲۷) اور شیعی امیر

"ایک دفعہ دورانِ سفر آپ ہرات تشریف لے گئے۔ وہاں کا شیعی امیر سخت متعصب تھا۔ اور جو شخص حضراتِ ثلثہ کے نام پر نام رکھتا۔ اسے قتل کرا دیتا تھا۔ آپ اس کے خاص باغ میں لبِ حوض تشریف فرما ہوئے۔ اس نے جب آپ کو اس حالت میں دیکھا تو غضب ناک ہو کر تکلیف دہی کا ارادہ کیا۔ آپ نے ایک نگاہ اس پر ڈالی وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ حضرت نے تھوڑی دیر میں اس پر حوض کا پانی ڈالا جس سے وہ ہوش میں آیا، لیکن اس حال میں کہ سخت معتقد تھا۔ اور مع اپنے اراکین حضرت سے بیعت ہو گیا اور خلافتِ ظاہری و باطنی سے آپ کا نائب امیر بنا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا۔ ص ۱۶۸)

۹۔ قصیب البان (م ۵۷۰ھ) کی تبدیلی اشکال

" آپ غوث الاعظم کے کامل ترین مریدوں سے تھے، مگر بے نماز تھے۔ کسی نے غوث الاعظم سے اس بات کی شکایت کی، تو فرمایا: "اُن کا سر ہمیشہ کعبہ کی دہلیز پر رہتا ہے۔" قاضی موصل کو ان سے سخت اختلاف تھا۔ ایک روز موصل کے کسی بازار سے گزرتے ہوئے قاضی سے دوچار ہو گئے۔ قاضی نے دِل میں کہا۔ آج موقعہ ہے۔ گرفتار کرکے حاکم کے پیش کر دینا چاہئے۔ قاضی نے اچانک دُور سے دیکھا کہ گرد اُڑ رہی ہے۔ جب وہ گرد قریب ہوئی تو معلوم ہوا کہ کوئی مغرور قوی ہیکل پہلوان ہے اور قریب ہوا تو ایک اعرابی کی صُورت میں منتقل ہو گیا۔ پھر عالم و فقیہہ کی شکل میں ظاہر ہوا اور قریب آکر کہنے لگا۔ کہو ان تین شکلوں میں سے کون سی شکل حاکم کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہو۔ قاضی اس تبدیلیٔ ہیئت سے خوفزدہ ہو کر شیخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۶۸)

اب دیکھئے کہ:

۱۔ قصیب البان بے نماز ہونے کے باوجود پیران پیر کے کامل ترین مریدوں میں سے تھا۔
۲۔ غوث الاعظم نے ترکِ نماز کی شکایت پر اس بے نماز ہی کی طرفداری فرمائی۔ آخر مرید جو تھا۔
۳۔ ایسے بے نمازوں سے بھی ایسی عظیم الشان کرامات صادر ہوسکتی ہیں کہ پڑھے لکھے اور پابندِ شرع قاضی قسم کے لوگ بھی ان کے مُرید بن جاتے ہیں۔

۱۰۔ فریدالدین گنج شکر (م ۶۶۰ھ) چھ سال کی عمر میں کرامت

"حضرت نظام الدین فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ (فریدالدین) کی والدہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ ایک چور چوری کرنے آیا۔ جب اس کی نگاہ والدہ پر پڑی، فوراً اندھا ہوگیا۔ اس نے آواز دی: "اگرچہ میں چوری کی نیت سے آیا تھا اور نابینا ہوگیا ہوں، مگر اب عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی چوری نہ کروں گا۔" حضرت شیخ کی عُمر اس وقت چھ سال کی تھی۔ حضرت نے دُعا کی۔ اللہ کے فضل سے اچھا ہوگیا۔ صبح جا کر معہ اہل وعیال مشرف بہ اسلام ہوا۔ عبداللہ نام تجویز ہوا۔ اور اخیر تک حضرت شیخ کی خدمت میں رہا۔ (تاریخ مشائخ چشت۔ مولانا زکریا صـ۱۷۷)

غور فرمائیے چھ سال کے شیخ کے دستِ حق پرست پر یہ کافر چور معہ اہل وعیال مشرف بہ اسلام ہو رہا ہے اور اس وقت سے لے کر انہیں کا ہو رہتا ہے۔ اس نے اس چھ سالہ شیخ سے اسلام کا کیا سیکھا ہوگا؟

۱۱۔ خواجہ فریدالدین گنج شکر (م ۶۶۰ھ)

"آپ کے پاس ایک عورت رُوتی ہوئی آئی اور کہا کہ بادشاہ نے میرے بے گناہ بچہ کو تختہ دار پر کھنچوا دیا۔ آپ اپنا عصا ہاتھ میں لئے اپنے اصحاب سمیت اس کے ساتھ ہو لئے اور دار کشیدہ لڑکے کے پاس پہنچے۔ ہندو مسلمان کی ایک بھیڑ لگ گئی۔ خواجہ نے کہا: "الٰہی! اگر اسے بادشاہ نے بے گناہ دار پر کھینچا تو اسے زندہ کردے۔" آپ کہہ ہی رہے تھے کہ لڑکا زندہ ہوگیا اور ساتھ چلنے لگا۔ یہ کرامت دیکھ کر کئی ہزار ہندو مسلمان ہوگئے۔" (اسرار الاولیاء۔ ملفوظات خواجہ فریدالدین گنج شکر، ص ۱۱۰۔ ۱۱۱ مرتبہ خواجہ بدر اسحاق، ترجمہ غلام احمد بریاں۔ مطبع مجتبائی دہلی، س ۱۹۱۶ء)

۱۲۔ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) کا پانی بننا

"قطب عالم عبدالقدوس گنگوہی جب باطنی علوم سے فارغ ہو کر گنگوہ تشریف لاتے، تو ایک ہندو جوگی سے سابقہ پیش آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: "کتنی روحانی ترقی کرلی ہے؟" کہنے

لگا۔ بہت، جو صورت چاہوں بن سکتا ہوں۔ دیکھو ابھی پانی بنتا ہوں۔" چنانچہ وہ اسی وقت پانی بن گیا آپ نے کپڑے کی ایک دھجی اس سے تر کر کے رکھ لی۔ پھر اس جوگی کے ہوش میں آتے ہی فرمایا کہ اب میں پانی ہوتا ہوں، تو اس میں سے ایک کپڑا تر کر کے رکھ لینا۔ اس کے بعد یہ کپڑے سونگھے گئے، تو پہلے کپڑے میں بدبو کی وجہ سے دماغ پھٹا جاتا تھا اور دوسرے میں خوشبو کی وجہ سے دماغ معطر ہو رہا تھا۔ جوگی بولا "میں تو اپنے فن و ہنر میں کامل تھا۔ آپ بھی کامل نکلے۔ صرف خوشبو اور بدبو کا فرق رہا۔ فرمایا: "یہ کفر و اسلام کا فرق ہے۔ چنانچہ وہ اسی وقت آپ کا مرید ہو کر مسلمان ہو گیا۔ اس جوگی کو آپ نے صاحب ولایت مقرر کر کے کہیں اور بھجوا دیا۔ حضرت کا روضہ بھی اسی جگہ ہے۔" (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند جنوری ۱۹۶۰ء، ص ۴۔ بگران اعلیٰ قاری محمد طیب صاحب)

ذرا غور فرمایئے کہ یہ جوگی صاحب ولایت مقرر ہو کر جہاں گئے ہوں گے، تو وہ لوگوں کو وہی کچھ سکھلاتے ہوں گے جو کچھ انہیں آتا تھا۔ اسلامی تعلیمات سے جب وہ خود ہی بے بہرہ تھے تو دوسروں کو اسلام کیا سکھلاتے ہوں گے؟

۱۳۔ امیر کلال (م ۷۷۳ھ) کی کشتی کا فلسفہ

"امیر کلال باباسماسی سے بیعت ہونے سے پہلے کشتی لڑا کرتے تھے۔ ایک بار کشتی لڑ رہے تھے کہ باباسماسی کا اُدھر سے گزر ہوا۔ لوگوں کے دل میں خیال آیا کہ کشتی لڑنا تو بدعت ہے۔ ایسے بزرگ اور سید زادے کو ان بدعتوں سے کیا واسطہ۔ اسی وقت ان لوگوں پر نیند اور غنودگی طاری ہو گئی۔ خواب دیکھا کہ قیامت برپا ہے اور لوگ کیچڑ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اتنے میں امیر کلال تشریف لاتے اور اُن کو کیچڑ سے نکال دیا۔ جب وہ لوگ نیند سے بیدار ہوئے، تو حضرت امیر کلال نے اُن کے کان پکڑ کر فرمایا کہ "ہم اس روز کے لئے نبرد آزمائی کرتے اور کشتی لڑتے ہیں۔ بزرگوں کی طرف سے بدعقیدہ نہ ہونا چاہتے۔" اس پر سب نے توبہ کی اور آپ کی تربیت سے مردان خدا بن گئے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۶۱)

غور فرمایا آپ نے کتنی لاجواب کرامت ہے۔ ابھی امیر کلال بیعت بھی نہیں ہوئے، نہ فقیری لائن میں داخل ہوئے، لیکن کرامت ظاہر ہو گئی جس کا آدھا حصہ خواب سے تعلق رکھتا ہے آدھا بیداری سے۔ ابھی امیر کلال کشتی ہی لڑا کرتے ہیں۔ خود ابھی باباسماسی نے اُن کی طرف توجہ بھی نہیں فرمائی، لیکن سب لوگ آپ کے دستِ حق پرست پر توبہ بھی کرتے اور مردانِ خدا بھی بن جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس روایت اور کرامت نے مل کر بدعت

کی کیسی جامع و مانع تعریف بیان فرمادی اور اُس کا فلسفہ بھی بیان کردیا کہ پہلوان حضرات ہی قیامت کے دن سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوں گے۔

۱۴۔ پیر حسن کبیر الدین (م ۸۵۳ھ) کی دعوت پیر حسن کبیر الدین شیعہ امامیہ اسماعیلیہ کے پیر اور مبلّغ تھے۔ ان کے متعلق نور مبین میں بحوالہ کتاب گلزار شمس لکھا ہے کہ:۔

"آپ نے چالیس سال تک ایک پاؤں پر کھڑے رہ کر عبادت کی تھی اور اپنی کرامت سے گنگا ندی کا پانی اوچھ گاؤں میں منگوا کر اس میں ہندوؤں کو اشنان کرواتے تھے۔ جس کے باعث کثرت سے لوگ مذہب اسمٰعیلی میں داخل ہوتے تھے۔ نیز آپ نے ایک مردہ بلوچ کو زندہ کیا تھا۔ (نور مبین، مرتبہ اے جے چنارا، مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند بمبئی)

۸۔ اولیاء اللہ کا وعظ اور تاثیرِ کلام

اولیاء اللہ چونکہ معرفت کے خزینے ہوتے ہیں، لہٰذا ان کا کلام بھی حقائق معرفت سے لبریز ہوتا ہے ان کا وعظ ایسا نہیں ہوتا جیسے رسول اللہ ﷺ کا تھا کہ اس پر کافروں کی طرف سے آپ کو بے شمار اذیتیں پہنچائی گئی تھیں۔ نہ ہی ان کا وعظ عام علمائے اُمت کی طرح ہوتا ہے جو لوگوں کو خوفِ خدا کی تلقین کرنے اور احکامِ شرعیہ کی پابندی کے لئے دعوت دیتے ہیں۔ پھر کسی پر کچھ اثر ہو جاتا ہے کسی پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اولیائے اللہ کا وعظ اور تاثیر کوئی جداگانہ چیز ہی ہوتی ہے جس سے پہلے سے مسلمان سامعین بھی مرنا شروع ہو جاتے ہیں چند ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

جنید بغدادیؒ (م ۲۹۸ھ) کا پہلا وعظ "شیخ جنید نے جب علوم ظاہر و باطن کی تکمیل کر لی تو شیخ سریؒ[1] (ان کے مُرشد، م ۲۵۰ھ) نے انہیں وعظ کی اجازت دی، لیکن شیخ جنید نے اپنے استاد کے پاس ادب کی وجہ سے وعظ نہ کہا۔ رات کو خواب میں رسول اللہ ﷺ نے کہا: "اے جنید! وعظ کیوں نہیں کہتا۔ اللہ نے تیری زبان میں بڑی تاثیر دی ہے"۔ صبح کو شیخ سری ملے تو کہا: "میں نے نہ کہا تھا کہ لوگوں سے کلام کر۔ بس اب رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق وعظ کر۔" چنانچہ جنیدؒ کی پہلی مجلس میں چالیس آدمی حاضر ہوئے۔ جن میں سے سترہ[2] شیخ کی تاثیرِ کلام سے جان بحق ہو گئے اور بیس بے ہوش ہو گئے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۳۹)

---

[1] شیخ سری سقطی (م ۲۵۰)، آپ جنید بغدادی کے مُرشد ہیں۔ بغداد میں سب سے پہلے آپ ہی نے برسرِ منبر حقائق توحید (یعنی توحید وجودی کے اسرار و رموز بیان کئے۔ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۳۱)

معلوم ہوا آپ کو کہ تاثیرِ کلام کس چیز کو کہتے ہیں اور وعظ کس چیز کو؟ پہلے ہی وعظ میں چالیس میں سے ستّرہ تو فوراً مر گئے اور بیس بے ہوش ہو گئے، وہ گھر جا کر مر گئے ہوں گے یا دوسرا وعظ سن کر مر جائیں گے۔ یہ وعظ تھا یا کسی بس کا شدید ایکسیڈنٹ یا آسمانی صاعقہ اور جو تین ٹھیک ٹھاک رہے وہ بڑے سخت جان یا شقی القلب ہوں گے

پیرانِ پیر (م ۵۶۱ ھ) کا وعظ

”۵۲۱ ھ میں باشارۂ[1] رسول اکرم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ منبر پر وعظ کہنا شروع کیا۔ آنجناب اکثر حالتِ وعظ میں فرمایا کرتے تھے کہ ”اے اہلِ آسمان وزمین! آؤ اور میری بات سنو کہ میں نائب و وارثِ رسول ﷺ ہوں۔“ آپ کی ہر مجلس میں ستر ہزار حاضرین کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ چار سو شخص آپ کے کلام کو لکھتے۔ تاثیرِ کلام کا یہ حال تھا کہ سامعین میں سے اکثر لذتِ ذوق وشوق وغلبۂ حال میں جان بحق ہو جاتے بعض پر بے خودی و وجد طاری ہو جاتا اور وہ کئی کئی دن تک ہوش میں نہ آتے۔ شیخ ابوسعید قیلوی فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی مجلسِ وعظ میں بارہا رسول اللہ ﷺ، دیگر پیغمبروں نیز ملائکہ اور جنات کو صف بہ صف دیکھا ہے۔“ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۵۹)

---

[1] اس اشارہ کی تفصیل سیرۃ غوث الثقلین کے صفحہ ۷۰ پر یوں دی گئی ہے۔

”غوثِ اعظم حالتِ بیداری میں نمازِ ظہر سے پہلے رسول اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے تو آپ نے فرمایا: ”اے میرے بیٹے! وعظ و نصیحت کیوں نہیں کرتے؟“ پیرانِ پیر نے کہا: ”ایک عجمی شخص ہوں فصحائے عرب کے سامنے کیسے تقریر کروں؟“ آپ نے فرمایا: ”اچھا منہ کھولو۔“ پیرانِ پیر نے منہ کھولا تو آپ نے سات مرتبہ اپنا لعاب مبارک منہ میں تھوکا اور کہا: ”اب وعظ و نصیحت کرو اور لوگوں کو نیکی کی دعوت دو۔“

پھر نمازِ ظہر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور کہا: ”بیٹا منہ کھولو۔“ پیرانِ پیر نے منہ کھولا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چھ بار منہ میں تھتکار کر فرمایا: ”وعظ و نصیحت کرو۔“ پیرانِ پیر نے پوچھا: ”آپ نے سات بار کیوں نہیں تھتکارا؟“ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”ادباً مع رسولِ اللہ یعنی رسول اللہ کے پاس ادب کی خاطر۔“

اس کے ساتھ ہی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: ”اے بیٹا! یہ خلعت پہنو۔“ پیرانِ پیر نے پوچھا: ”یہ خلعت کیسی ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ تمہاری ولایت کی خلعت ہے جو قطب اولیاء سے مخصوص ہے۔“

پیرانِ پیر کہتے ہیں کہ اس کے بعد ان (یعنی رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے فیض و برکات سے میں نے حقائق و معارف کو جان لیا حلقہ ارادت وسیع ہو گیا۔ (بہجۃ الاسرار، ص ۲۵۔ ۲۶ قلائد الجواہر، ص ۱۳ سفینۃ الاولیاء، ص ۴۶۔ اخبار الاخیار فارسی ص ۱۸۔ تحفہ قادریہ، ص ۱۹)

دیکھا آپ نے کتنی معتبر روایت تھی جسے صاحب خزینۃ الاصفیاء نے صرف باشارہ رسولِ اکرم ﷺ اور حضرت علی

بقیہ اگلے صفحہ پر

بات ہے ہی دل لگتی۔ بھلا جس مجلس میں رسول اللہ ﷺ اور دوسرے پیغمبر، ملائکہ اور جنات اور انسان سب آئیں، وہاں ستر ہزار کی تعداد معمولی بات ہے اور چار سو لکھنے والوں میں بھی شاید ملائکہ اور جنات شامل ہوں۔ البتہ یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ ملائکہ تو غیر مکلف مخلوق ہیں ان کے لئے وعظ و نصیحت بے کار چیز ہے۔ وہ اس مجلسِ وعظ میں کیا لینے آتے تھے؟ ممکن ہے کہ " اہلِ آسمان و زمین" کا فرمان سن کر اور حکم عدولی کی تاب نہ لا کر حاضر ہو جاتے ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی زندگی بھر وعظ فرمایا لیکن کبھی ایک آدمی بھی جاں بحق نہ ہوا نہ کوئی وجد و حال سے بے ہوش ہوا۔ اب پیرانِ پیر کے وعظ کے متعلق تین ہی احتمالات ہو سکتے ہیں:

۱۔ آپ کا وعظ رسول اللہ سے بہت زیادہ پُر تاثیر ہوتا ہو۔

۲۔ آپ کا وعظ وہ کچھ نہ ہو، جو کچھ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے بلکہ کسی دوسری نوعیت کا جداگانہ موضوع رکھتا ہو۔

۳۔ تذکرہ نویسوں نے انتہائی مبالغہ آرائی اور بے احتیاطی سے کام لیا ہو۔

ہمارے خیال میں تیسری بات زیادہ قرینِ قیاس ہے، آپ جو چاہے سمجھ لیجئے۔

۹۔ برِصغیر پاک و ہند میں اشاعتِ اسلام میں صوفیاء کا کردار

صوفیاء کی طرف سے بڑے شد و مد سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ برِصغیر پاک و ہند میں اشاعتِ اسلام کا سہرا صوفیائے کرام کے سر پر ہے۔ پھر وہ لوگ جو صوفیائے کرام سے کچھ زیادہ ہی حسنِ عقیدت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ:

"سچی بات تو یہ ہے کہ جملہ اہلِ اسلام ان بے نوا فقیروں کے ممنونِ احسان ہیں۔ جن کے صدقے اِن کے دِل نورِ اسلام سے منور ہوئے۔ ورنہ کیا خبر آج ہم کسی مندر میں دیوی کے چرنوں میں آلتی پالتی مارے بیٹھے اس کی ڈنڈوت بجالا رہے ہوتے۔" (روحِ تصوف، ص ۱۰۷)

جناب خورشید احمد گیلانی کے خیال کے مطابق تو سچی بات یہ ہے جو اقتباسِ بالا میں مندرج ہے اور ہمارے خیال میں صوفیاء، اور ان کے حسنِ عقیدت رکھنے والے حضرات جس طرح کئی دوسری باتوں میں مبالغہ اور غلو

کہہ کر گول مول کر دیا۔ یہ بات البتہ ہم سمجھنے سے قاصر ہی رہے کہ فیوض و برکات تو آپ رسول اللہ ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حاصل کریں اور وعظ کا اثر بالکل ان کے متضاد ہو۔ یہ کیا معمہ ہے؟

سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اس معاملہ میں بھی مبالغہ اور بے احتیاطی سے کام لیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تاریخی حقائق صوفیاء کے اس دعویٰ کی پرزور تردید کرتے اور منہ چڑاتے نظر آتے ہیں۔

صوفیاء کی برِصغیر پاک و ہند میں آمد

برِصغیر پاک و ہند میں اسلام اس وقت آچکا تھا جب کہ ابھی نہ کسی صوفی کا اس دنیا میں وجود تھا نہ تصوف کا۔ گو دوسری صدی ہجری کے اواخر یا تیسری صدی کے اوائل میں چند ایک بزرگوں کو صوفی کہا جانے لگا تھا۔ تاہم ان کی ابتدا تیسری صدی ہجری میں شمار ہوتی ہے اور جو صوفیائے کرام برِصغیر پاک و ہند میں تشریف لائے اور ان کی وساطت سے ہند میں اشاعتِ اسلام کا کام ہوا، ان میں سے دو ہستیاں ہی زیادہ مشہور ہیں، جو پہلے پہل تشریف لائیں۔ پہلے حضرت علی ہجویری (۴۰۰ھ/۱۰۰۹ء - ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) ہیں۔ یہ ہندوستان میں ۴۶۲ھ/۱۰۶۹ء میں تشریف لائے اور دوسرے بزرگ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری (۵۳۷ھ/۱۱۴۲ء، ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء) ہیں۔ جن کی ہندوستان میں آمد کی تاریخ دس محرم ۵۶۱ھ بمطابق ۱۱۶۱ء بتلائی جاتی ہے، جو کہ سخت مشکوک ہے۔ تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق بھی یہ تاریخ ۵۷۰ھ اور ۵۸۰ھ کے درمیان ہونی چاہیئے۔[1]

ان دو مشہور بزرگوں کے علاوہ دو اور بزرگوں کی آمد کا بھی تذکروں سے بھی پتہ چلتا ہے۔ ان میں ایک تو

---

[1] آپ کی تاریخِ پیدائش ۵۳۶ھ یا ۵۳۷ھ ہے۔ پندرہ سال کے تھے کہ والد نے اور پھر ایک سال بعد والدہ نے وفات پائی۔ آپ کو ایک باغ اور ایک چکی ورثہ میں ملی اور آپ نے باغبانی کو ذریعہ معاش بنایا۔ اسی اثناء میں ایک مجذوب ابراہیم قندوزی سے ملاقات ہوئی اور زندگی نے پلٹا کھایا: تمام اثاثہ بیچ کر رقم فقراء کو دے دی۔ پھر پہلے سمرقند اور بخارا گئے اور وہاں حفظِ قرآن، تفسیر فقہ، حدیث اور دوسرے علومِ ظاہری میں مہارت حاصل کی۔ (انسائیکلوپیڈیا فیروز سنز ص ۱۲۴۲) ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ نے علومِ ظاہری سے فراغت حاصل کی تھی اس وقت آپ کی عمر کم از کم بیس سال تو ضرور ہوگی۔ اس کے بعد آپ خواجہ ہارونی کی بیعت ہوئے اور ایک ہی دن میں تکمیل ہوگئی اور ساتھ ہی ساتھ حضرت شیخ کی توجہ سے سب علوم حاصل ہوئے اور اس کے بعد امتثال امر کی وجہ سے بیس سال حضرت کی خدمت میں اور رہے (تاریخ مشائخ چشت مولانا زکریا، ص ۱۶۶) گویا جب آپ عثمان ہارونی سے فارغ ہو کر ہندوستان آئے، تو آپ کی عمر از کم چالیس سال کی ہوگی یا یہ ۵۷۷ھ کا واقعہ ہے۔ لیکن یہی مولانا زکریا آپ کی ہندوستان میں آمد محرم ۵۶۱ھ بتلاتے ہیں۔ یعنی ۲۴ سال کی عمر میں آپ اجمیر تشریف لائے اور یہ بات قطعاً غلط ہے کیونکہ آپ ہارونی صاحب سے فراغت کے بعد کئی دوسرے بزرگوں سے ملے اور فیض حاصل کرتے رہے۔ پھر علی ہجویری کے مزار پر چلہ بھی کاٹا۔ پھر پہلے دہلی گئے بعد میں اجمیر آئے، تو اس لحاظ سے آپ کی اجمیر آنے کی تاریخ ۵۸۰ھ کے لگ بھگ ہونی چاہیئے۔

شیخ محمد اسماعیل بخاری ہیں جو ~~۳۹۵ھ~~ ۱۰۰۵ء میں لاہور تشریف لائے۔ (روحِ تصوف، ص ۹۹ اور ۱۰۲) اور دوسرے بزرگ خواجہ ابو محمد بن ابو احمد جو محمود غزنویؒ کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، خلیق نظامی، ص ۱۴۲) اور محمود غزنوی نے ۱۰۰۱ء سے لے ۱۰۲۵ء تک ہندوستان پر سترہ حملے کئے تھے۔ آخری حملہ سومنات پر ۱۰۲۵ء میں کیا گیا۔

ان تمام تر تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی صوفی بزرگ، وہ مشہور و معروف ہو یا غیر معروف، سلطان محمود غزنویؒ سے پہلے برِ صغیر پاک و ہند میں وارد نہیں ہوا تھا۔ لیکن مسلمان ہمیں اس سے بہت پہلے یہاں نظر آتے ہیں۔ جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ اور یہ تفصیل ہم "تاریخ پاک و ہند" (مصنفہ پروفیسر عبداللہ ملک صدر شعبہ تاریخ اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور، ساتواں ایڈیشن ۱۹۷۸ء) سے پیش کر رہے ہیں۔ آپ کی یہ کتاب کالجوں میں بطورِ نصاب پڑھائی جاتی ہے۔

"اسلام مذہب کی حیثیت سے پہلے جنوبی ہند میں پہنچا۔ مسلمان تاجر اور مبلغین ساتویں صدی عیسوی میں (یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ۶۳۲ء میں ہوئی تھی۔ یعنی آپ کی وفات کے بعد جلد ہی مسلمان) مالابار اور جنوبی سواحل کے دیگر علاقوں میں آنے جانے لگے۔ مسلمان چونکہ بہترین اخلاق و کردار کے مالک اور کاروباری لین دین میں دیانتدار واقع ہوئے تھے، لہٰذا مالابار کے راجاؤں، تاجروں اور عام لوگوں نے ان کے ساتھ رواداری کا سلوک روا رکھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے برِصغیر پاک و ہند کے مغربی ساحلوں پر قطعاتِ اراضی حاصل کر کے مسجدیں تعمیر کیں۔ (یاد رہے کہ اس وقت خانقاہوں کی تعمیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا) اور اپنے دین کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ ہر مسلمان اپنے اخلاق اور عمل کے اعتبار سے دینِ اسلام کا مبلغ تھا۔ نتیجتاً عوام ان کے اعمال و اخلاق سے متاثر ہوتے چلے گئے۔ تجارت اور تبلیغ کا یہ سلسلہ ایک صدی تک جاری رہا یہاں تک کہ مالابار میں اسلام کو خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا اور وہاں کا راجہ بھی مسلمان ہو گیا۔ جنوبی ہند میں فروغِ اسلام کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں جنوبی ہند مذہبی کشمکش کا شکار تھا۔ ہندو دھرم کے پیرو کار بدھ مت اور جین مت کے شدید مخالف اور ان کی بیخ کنی میں مصروف تھے۔ ان حالات میں جب مبلغینِ اسلام نے توحیدِ الٰہی اور ذات پات اور چھوت چھات کو لایعنی اور خلافِ انسانیت قرار دیا، تو عوام جو ہزاروں سال سے تفرقات اور امتیازات کا شکار ہو رہے تھے۔ بے اختیار اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔ چونکہ حکومت اور معاشرہ کی طرف سے تبدیلیٔ مذہب پر کوئی پابندی نہ تھی۔ لہٰذا ہزاروں غیر مسلم

مسلمان ہو گئے۔" (تاریخ پاک و ہند، ص ۳۹۰)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل امور واضح ہوتے ہیں :

۱۔ پہلی ہی صدی ہجری میں اسلام جنوبی ہند بالخصوص مالیبار اور مغربی سواحل میں پھیل گیا تھا۔ ان علاقوں کے ہزارہا غیر مسلم مسلمان ہو چکے تھے اور راجہ بھی مسلمان ہو گیا تھا۔

۲۔ اشاعتِ اسلام کی اصل وجوہات تین تھیں :

(۱) عقیدہ توحیدِ الٰہی کی سادگی۔ (۲)۔ ذات پات اور چھوت چھات کو خلافِ انسانیت قرار دینا اور (۳) مسلمانوں کے اعمال و اخلاق کی پاکیزگی اور شائستگی۔

گویا ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کا اصل سبب اولیاء اللہ یا صوفیاء کی مزعومہ کرامات نہیں بلکہ درج بالا وجوہات تھیں۔

اب اس پہلی صدی ہجری میں برصغیر پاک و ہند میں جن جن مقامات پر اشاعتِ اسلام ہوئی اس کی مزید تفصیل درج ذیل اقتباس میں ملاحظہ فرمائیے :

"برصغیر پاک و ہند میں عربوں کے تجارتی مراکز میں سراندیپ، مالدیپ، مالابار، کارومنڈل، گجرات اور سندھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جنوبی ہند اور ساحلی علاقوں میں بھی جا بجا عرب تاجروں کی نوآبادت موجود تھیں۔ جہاں عراق اور عرب کے تاجر موجود تھے۔ ظہورِ اسلام کے بعد عربوں کی سیاسی، مجلسی اور اقتصادی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ اب وہ تبلیغِ اسلام کے شوق سے سرشار، اخلاق و اطوار کے لحاظ سے بلند معیار کے حامل اور صداقت و دیانت کے پیکر تھے۔ ان میں سے اکثر نے برصغیر میں ہی رہائش اختیار کر لی۔ آہستہ آہستہ جنوبی ہند کے اکثر مقامات پر مسلمانوں کی نوآبادت قائم ہو گئیں۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو مشرف بہ اسلام کرنا شروع کر دیا۔ مقامی راجاؤں سے مسلمان تاجروں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے اور انہیں تبلیغِ اسلام اور عبادت کی پوری آزادی حاصل تھی۔" (ایضاً، ص ۱۷، ۱۸)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ :

پہلی صدی ہجری میں اسلام صرف مالابار اور مغربی سواحل پر ہی نہیں پھیلا بلکہ جزائر سراندیپ، مالدیپ اور علاقہ ہائے کارومنڈل، گجرات اور سندھ میں اسلام کی اشاعت ہو چکی تھی۔ ان مقامات پر مسلمان عربوں کی نوآبادیات بھی قائم تھیں اور بہت سے عرب مسلمان مستقلاً یہاں قیام پذیر ہو کر اسلام کی تبلیغ اور اشاعت میں

منہمک ہوگئے تھے۔

برِصغیر میں اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں یہ کچھ تو نجی سطح پر ہوا۔ اب جو کچھ سرکاری سطح پر ہوا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱۔ دورِ فاروقی ـــــ میں بحرین وعمان کے حاکم عثمان بن ابوالعاص ثقفی نے ۶۳۶ء - ۶۳۷ء میں (وفات نبوی ﷺ سے صرف چار سال بعد) ایک فوجی مہم تھانہ نزد بمبئی میں بھیجی۔ پھر اس مہم کی اطلاع حضرت عمر کو دی۔ آپ ناراض ہوئے اور لکھا کہ "تم نے میری اجازت کے بغیر سواحلِ ہند پر فوج بھیجی۔ اگر ہمارے آدمی وہاں مارے جاتے تو میں تمہارے قبیلہ کے اتنے ہی آدمی قتل کر ڈالتا" (ایضاً، ص ۱۸)

۲۔ عہدِ عثمانی ـــــ میں عراق کے حاکم عبداللہ بن عامر نے حکیم بن جبلہ کو برِصغیر کے سرحدی حالات کی تحقیق پر مامور کیا۔ واپسی پر انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی رپورٹ میں بتلایا کہ "وہاں پانی کمیاب ہے۔ پھل نکمے ہیں ڈاکو بہت دلیر ہیں اگر قلیل التعداد فوج بھیجی گئی تو ہلاک ہو جائے گی اور اگر زیادہ لشکر بھیجا گیا، تو بھوکوں مر جائے گا" اس رپورٹ کی بناء پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مہم بھیجنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ (ایضاً، ص ۱۹)

۳۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں مشہور سپہ سالار مہلب بن ابی صفرہ نے برِصغیر کی سرحد پر حملہ کیا اور لاہور تک بڑھ آیا۔ انہی ایام میں خلیفہ اسلام نے ایک اور سپہ سالار عبداللہ بن سوار عبدی کو سواحل برِصغیر کے سرکش لوگوں کی گوشمالی کے لئے چار ہزار کی عسکری جمعیت کے ساتھ بھیجا۔ اس نے قیقان کے باشندوں کو سخت شکست دی اور مالِ غنیمت لے کر واپس چلا گیا۔ اس نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں قیقانی گھوڑے پیش کئے، لیکن کچھ مدت بعد عبداللہ بن سوار قیقان واپس آ گیا، جہاں ترکوں نے یورش کر کے اسے قتل کر دیا۔" (ایضاً، ص ۱۹)

۴۔ بعد ازاں ۷۱۲ء یعنی ۹۳ھ میں ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے برِصغیر میں اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں بڑا مؤثر کردار ادا کیا یعنی محمد بن قاسمؒ نے اس سال سندھ کے سارے علاقہ کو فتح کر لیا۔ اس حملہ کے اسباب اور محرکات ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ہم تو یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس مہم میں محمد بن قاسمؒ نے دیبل، نیرون، سیوستان، سیسم، راوڑ، برہمن آباد، اوور، باتیہ (موجودہ بہاولپور کے قرب و جوار میں واقع تھا) اور ملتان کو فتح کر لیا اور قنوج کی تسخیر کا ارادہ کر رہا تھا کہ اسے واپس بلا لیا گیا۔

محمد بن قاسمؒ کے جانے کے بعد فتوحات کا سلسلہ اچانک رک گیا۔ بہرحال عرب سندھ و ملتان پر دو سو سال

سے زیادہ عرصہ تک (یعنی دسویں صدی عیسوی تک) قابض رہے۔ چوتھی صدی ہجری تک خلیفۃ المسلمین والیانِ سندھ کا تقرر کرتا رہا۔ اس کے بعد سندھ میں عربوں کی دو نیم آزاد ریاستیں قائم ہوگئیں۔ ان میں سے ایک ملتان اور دوسری منصورہ تھی۔ (ایضاً، ص ۳۵)

محمد بن قاسم کی ان فتوحات نے اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں کیا کردار ادا کیا، وہ پروفیسر عبدالقادر و شجاع الدین کی زبان سے سنئے:

"فتح سندھ کے بعد بے شمار علماء، مبلغین، تاجر اور صناع عرب سے آکر سندھ میں آباد ہوئے۔ مقامی باشندوں میں اسلام رائج ہوا اور یہ سرزمین فرزندانِ توحید کا گہوارہ بن گئی۔ آج سندھ اسی طرح اسلامی خطہ ہے جس طرح عراق اور مصر۔ ہم عربوں کی فتح سندھ کی عظمت، اس کی تاریخی اہمیت اور اس کے نتائج کے منکر نہیں ہو سکتے۔" (ایضاً، ص ۴۰)

۵۔ ۹۸۶ء (چوتھی صدی ہجری) میں سبکتگین غزنوی نے پشاور کے قریب جے پال کو شکست دے کر لمغان (جلال آباد) سے دریائے سندھ تک کے تمام علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ برِصغیر کی عسکری کمزوری مسلمانوں پر عیاں ہوگئی اور سندھ پار کے علاقے میں ایک طاقتور اسلامی حکومت قائم ہوگئی جو بعد ازاں پنجاب اور برِصغیر کے دوسرے حصوں پر چھا گئی۔ نیز برِصغیر کی فتح کے دروازے کھل گئے۔

سبکتگین کے عہد کا دوسرا اہم واقعہ افغان قوم کے معرضِ وجود میں آنے کا ہے۔ افغان پشاور اور غزنی کے درمیانی علاقہ کے باشندے تھے اور متعدد قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ سبکتگین نے ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ان سے دوستانہ مراسم استوار کئے اور وہ تمام علاقے جو اُن کے قبضہ میں تھے ان کے سپرد کر دیتے۔ نتیجتہً افغان قوم کی بنیاد پڑی۔ نیز یہ قبائل نہ صرف حلقہ بگوش اسلام ہوئے بلکہ سلاطین غزنہ کی افواج میں بھرتی بھی ہوگئے۔" (ایضاً، ص ۶۴)

۶۔ سبکتگین کے بعد سلطان محمود غزنوی (۹۹۷ تا ۱۰۳۰ء) کا دور آتا ہے جس نے پہلا حملہ ۱۰۰۱ء میں برِصغیر پر کر کے درۂ خیبر کے نواحی علاقوں کی تسخیر کی۔ اس نے کُل ۱۷ حملے برِصغیر پر کئے تھے۔ آخری حملہ ۱۰۲۵ء میں کیا جس میں سومنات کو فتح کیا۔ اس دوران محمود غزنوی نے برِصغیر کے جن علاقوں کو فتح کیا اُن کے نام یہ ہیں:

درۂ خیبر اور اس کے نواحی علاقے، ملتان (یہاں کا حاکم شیخ حمید لودی مسلمان تھا، لیکن محمود غزنوی کی مخالف اور بھرہ

کے راجہ بجے رائے کا حلیف تھا) پنجاب، کانگڑہ، نگرکوٹ، تھانیسر، شندنہ، کشمیر، قنوج، کالنجر، گوالیار اور سومنات۔

فتح سومنات کے متعلق ابن اثیر، ابن خلدون اور فرشتہ کا بیان ہے کہ:

"جب محمود نے برِصغیر پاک و ہند کے مختلف راجگان کو شکست دی اور ہندوؤں کے متعدد مندر اس کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہوئے، تو ہندوؤں نے کہنا شروع کر دیا کہ جن دیوتاؤں کے مندر برباد ہوئے ہیں ان سے شوجی (سومنات کا بڑا دیوتا) ناراض تھے۔ اگر محمود نے سومنات پر حملہ کیا، تو منہ کی کھائے گا۔" چنانچہ محمود نے ہندوؤں کے اس خیال کو باطل ثابت کرنے کے لئے اور بتوں کی جھوٹی عظمت کو ختم کرنے کے لئے سومنات پر حملہ آور ہونے کا عزمِ صمیم کیا۔ تاکہ لوگوں پر بتوں کی بے بسی اور بے ثباتی واضح ہو جائے اور لوگ بت پرستی اور شرک کو ترک کر دیں۔ پھر جب محمود نے سومنات کو بھی فتح کر لیا۔ تو اس فتح کی خبر نے عالمِ اسلام میں مسرت کی لہر دوڑا دی۔ اور خلیفہ بغداد نے خوش ہو کر سلطان محمود اس کے بیٹوں اور بھائی کو خطابات اور اعزازات سے نوازا۔ سومنات کا بت تباہ و برباد ہو گیا، لیکن سلطان محمود کے نام کو شہرت و دوام حاصل ہو گئی۔" (ایضاً ص۱۶)

سلطان محمود غزنوی (م ۱۰۳۰ء) کے بعد اس کے جانشین مزید ڈیڑھ سو سال یعنی ۱۱۸۶ء تک ان علاقوں پر قابض رہے۔ جن کے نام ہیں:

۱۔ سلطان مسعود (۱۰۳۰ء تا ۱۰۴۰ء) ۲۔ سلطان مودود (۱۰۴۲ء تا ۱۰۴۹ء)

۳۔ " ابوالحسن علی (۱۰۴۹ء تا ۱۰۵۱ء) ۴۔ " عزالدولہ عبدالرشید (۱۰۵۱ء تا ۱۰۵۲ء)

۵۔ " فرخ زاد (۱۰۵۳ء تا ۱۰۵۹ء) ۶۔ " ابراہیم (۱۰۵۹ء تا ۱۰۹۹ء)

۷۔ " مسعود سوم (۱۰۹۹ء تا ۱۱۱۴ء) ۸۔ شیر زاد (۱۱۱۴ء تا ۱۱۱۵ء)

۹۔ ارسلان (۱۱۱۵ء تا ۱۱۱۷ء) ۱۰۔ بہرام شاہ (۱۱۱۷ء تا ۱۱۵۲ء)

۱۱ خسرو شاہ (۱۱۵۲ء تا ۱۱۶۰ء) ۱۲۔ خسرو ملک (۱۱۶۰ء تا ۱۱۸۶ء)

۷ غزنی خاندان کے بعد خاندانِ غور ہند پر قابض ہوتا ہے۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری نے سب سے پہلے حملہ ۱۱۷۵ء میں ملتان کو فتح کیا۔ جس پر غزنویوں کے بعد دوبارہ قرامطی برسرِاقتدار آ گئے تھے۔ محمد غوری نے بھی ہندوستان کے بہت سے علاقوں کو فتح کیا۔ پھر غوریوں کے بعد ہندوستان میں خاندانِ غلاماں، خلجی، تغلق، سادات اور لودھی برسرِاقتدار آئے پھر ۱۵۲۶ء میں بابر نے ہندوستان میں مغلیہ خاندان کی بنیاد رکھی اور یہ مغلیہ

خاندان ۱۸۵۷ء تک برِ صغیر پاک و ہند میں برسرِ اقتدار رہا۔

یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷۱۲ء یا ۹۳ھ سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کوئی وقت ایسا نہیں گزرا جب کہ برِ صغیر کے کسی نہ کسی حصے پر مسلمانوں کی حکومت موجود نہ رہی ہو۔ اب صوفیاء کی طرف سے دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ پہلے صوفیاء ہندوستان گئے۔ انہوں نے وہاں اشاعتِ اسلام کا فریضہ انجام دیا اور مسلمان حکمرانوں کے حملہ اور فتح کے لئے زمین ہموار کرتے رہے۔ لیکن تاریخی حقائق کی روشنی میں صوفیاء کے اس مزعومہ دعوے کو کیوں کر باور کیا جا سکتا ہے جبکہ صوفی تو پیداوار ہی تیسری صدی ہجری کی ہیں اور پہلے صوفی جو ہندوستان تشریف لائے وہ اسمٰعیل بخاری ہیں جو ۱۰۰۵ء (۲۹۵ھ) میں محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان تشریف لاتے ہیں جبکہ مسلمان حکمرانوں کا ۷۱۲ء (۹۳ھ) سے لے ۱۸۵۷ء تک ایسا تسلسل قائم رہا ہے کہ اس میں ایک دن کا بھی انقطاع واقع نہیں ہوا۔

زیادہ سے زیادہ جو چیز باور کی جا سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ محمود غزنوی چونکہ خود بھی صوفی منش اور صوفیاء کا قدردان تھا اس لئے اس نے یہ تحریک پیدا کی کہ دوسرے علمائے دین کی طرح صوفیاء بھی اس سرزمین میں تشریف لائیں اور مفتوحہ علاقوں میں اشاعتِ اسلام کا فریضہ سرانجام دیں۔ چنانچہ پہلے صوفی جن کا نام تذکروں میں ملتا ہے وہ اسمٰعیل بخاری ہیں جنہیں ۱۰۰۵ء میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ حالانکہ وہ خود ۱۰۰۱ء سے ہندوستان پر حملے کر رہا تھا۔

۱۰۔ صوفیائے کرام کی تعلیم کی خصوصیات

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ صوفیاء کی آمد سے پہلے برِ صغیر میں جو بھی اسلام پھیلا تھا وہ خالص اسلام تھا اور اس میں دینِ طریقت کی آمیزش نہ تھی اور ان میں سے زیادہ تر اہل الحدیث تھے۔ چنانچہ عرب کے مشہور سیاح علامہ بشاری مقدسی ۳۷۵ھ میں ہندوستان تشریف لائے۔ وہ اپنی کتاب "احسن التقاسیم" میں صوبہ سندھ کے شہر "منصورہ" کے حال میں لکھتے ہیں کہ وکانوا اکثرھم اھل الحدیث یہاں کے مسلمانوں میں سے اکثر اہل الحدیث ہیں۔ (تاریخ سندھ، ص ۱۲۴، ج ۲)

مگر جو اسلام صوفیاء کے ذریعہ پھیلا وہ درج ذیل خصوصیات کا حامل تھا۔

ا۔ کشف و کرامات

۱۔ اس اسلام کی اشاعت کا انحصار اسلامی تعلیمات پر نہیں بلکہ کرامات پر ہوتا تھا یعنی جو بزرگ زیادہ اور بڑی

کرامتیں دکھلا سکتا تھا۔ اس کی اشاعتِ اسلام کا دائرہ بھی اسی مناسبت سے وسیع ہوتا تھا۔ چنانچہ خلیق نظامی صاحب اپنی کتاب "تاریخ مشائخ چشت" میں گلزار ابرار کے حوالہ سے نظام الدین اولیاء کی کرامات اور ان کرامات کے ذریعے اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں یوں رقمطراز ہیں کہ :

"آپ کی بارگاہِ خلافت سے وقتاً فوقتاً نئے نئے خلیفہ روانہ ہوتے تھے۔ ان کی فیض پاشی سے ہند کا ہر مکان اور ہر قطعہ زمین آباد تھا۔ آپ نے بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے مرتبہ اور بڑی بڑی کرامتوں والے سات سو ایسے خلیفہ روانہ کئے تھے کہ ہر شخص کے سینہ سے عرفان کا آفتاب طلوع ہوا کرتا تھا۔ نیز ان سینوں سے بزرگوار پیر کے اسرار عیاں ہوتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ جب کسی شخص کو کسی بزرگ کی خدمت سے معرفت کا سرمایہ ہاتھ آجاتا ہے اور ایک منزل سے دوسری منزل کو اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوجاتا ہے اور فنا کے درجات سے عبور کرکے بقائے اصلی کے مقام کو پہنچ جاتا ہے تو اس وقت نام اور صورت میں فرق کے سوا کسی قسم کی دوئی کی شکل ان دونوں شخصوں میں قائم نہیں رہتی۔" (گلزار ابرار (اردو) ص ۸۴، ۸۵)

۲۔ قبوری شریعت اور شرکیہ افعال

شریعتِ اسلامیہ نے قبروں کو پختہ کرنا، ان پر مزارات تعمیر کرنا ناجائز قرار دیا تھا مگر صوفیاء کا کام ہی چونکہ کشفِ قبور اور مزارات پر چلہ کشیوں پر منحصر تھا۔ لہٰذا اس طرح کا اسلام یہاں برصغیر میں رائج ہوگیا۔ پروفیسر سلیمان اظہر سیرت محمد بن عبدالوہاب کے مقدمہ میں اس صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :

"عوام عموماً ہندومت سے تائب ہوکر صوفیاء کے توسط سے مسلمان ہوئے تھے لیکن تبدیلیٔ مذہب سے ان کی معاشرت میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ پہلے مندروں میں بتوں کے سامنے سربسجود تھے تو اب مقابر سجدہ گاہ بن گئے پہلے دیوتاؤں کے سامنے دستِ دعا دراز کیا جاتا تھا، تو اب صوفیاء اور پیروں سے مرادیں مانگی جانے لگیں۔ احکامِ اسلام کی پابندی اور اعمالِ حسنہ کی کوئی قیمت نہ تھی۔ روحانی مدارج، شرکیہ وظائف، قبروں[1] پر چلہ کشی اور مرشد کی توجہ کے محتاج ہوکر رہ گئے تھے۔" (مقدمہ سیرت محمد بن عبدالوہاب، ص ۵)

پھر ان بزرگوں کی غیب دانی، حاجت روائی، مشکل کشائی اور تصرف فی الامور اور تصورِ شیخ جیسے مشرکانہ عقائد اس قدر عام ہوئے کہ کوئی ایسی باتوں کو شرک سمجھتا بھی نہ تھا۔ اس ظلمت کدہ کفر و شرک میں چند عالم صوفیاء مثلاً

---

[1] شریعتِ اسلامیہ نے کسی دیوی کے چرنوں میں ڈنڈوت بجالانے اور کسی قبر پر چلہ کاٹنے یا معتکف ہونے دونوں کو شرک قرار دیا ہے۔ پھر صوفیاء کے برصغیر کے مسلمانوں پر جس احسانِ عظیم کا تذکرہ جناب خورشید احمد گیلانی صاحب نے فرمایا ہے۔ اس کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی نے بعض مشرکانہ افکار و نظریات پر کاری ضرب لگائی مگر چوں کہ ان کا دامن بھی طریقت میں الجھا ہوا تھا۔ اس لئے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔

۳۔ غیر مسلموں کے ساتھ مخلوط معاشرت

ان بزرگوں نے الخلق عیال اللہ کی غلط تعبیر[1] پیش کر کے ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں سب کو اپنی خانقاہوں میں جمع کر لیا تھا اور ایک ایسا مخلوط معاشرہ پیدا کیا جو اپنے خیالات، عقائد اور مذہب کے مختلف ہونے کے باوجود ان بزرگوں کو یکساں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اور یہی دینِ طریقت کا وہ عنصر ہے، جو دینِ طریقت کو اسلام سے جدا کر دیتا ہے۔ خلیق نظامی صاحب اپنی کتاب "تاریخ مشائخ چشت" میں اس حقیقت کو یوں پیش فرماتے ہیں:

"اگر تاریخ کے اشاروں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سماجی نظام مشائخِ چشت کی کوششوں کا مرہونِ منت تھا۔ انہوں نے اِن علاقوں میں بسنے والے مختلف الخیال اور مختلف المذاہب لوگوں میں اتحادِ عمل اور اتحادِ فکر پیدا کیا اور اِن منتشر طبقوں کو ایک ایسے سماجی رنگ میں رنگ دیا جس نے ایک مضبوط معاشرہ کی شکل اختیار کر لی۔ اِن بزرگوں کی خانقاہوں میں ہندو اور مسلمان سب ہی جمع ہوتے تھے۔ ان مشائخ نے اِن اختلافات کے پردوں کو ہٹا کر ان میں ہم دلی اور ہم زبانی پیدا کی اور عمدہ سماجی ماحول پیدا کر دیا۔"

(تاریخ مشائخ چشت، خلیق نظامی، ص ۱۹۷)

نیز شیعوں کے فرقہ اسماعیلیہ کے ایک تذکرہ نگار اپنی تصنیف "نور مبین" میں رقمطراز ہیں کہ:

"پیر صدر الدین رم ۸۔رجب ۸۱۹ھ) نے ہندوستان واپس آکر امام حاضر اسلام شاہ کی زیارت کے بعد خود مختارانہ اسمٰعیلی مذہب کی دعوت کو نہایت زور سے کرنا شروع کیا۔ نتیجۃً تین شہروں میں بڑی جماعتیں قائم ہوگئیں۔ پنجاب جماعت کے مکھی سیٹھ شام داس لاہوری، کشمیر جماعت کے مکھی سیٹھ تلسی داس، اور سندھ جماعت کے مکھی ترکیم کو قائم کیا اور ضلع سندھ کے شہر کوٹری میں پیر صدر الدین کی حاضری میں پہلا جماعت خانہ تعمیر ہوا۔ اور مال واجبات حضرت امام زمانہ کے حق کو تمام جماعتوں سے وصول کر کے پیر صدر الدین نے ایران میں امام کی خدمت میں مریدوں کے ذریعہ بھجوایا ۔ ۔ ۔ پیر صدر الدین ہندوستان کے اولیاء اللہ میں سید صدر الدین الحسینی کے نام سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے بارہ قبائل کے آدمیوں کو فہمائش کر کے امام زمان کا تعارف

---

[1] الخلق عیال اللہ کی صحیح تعبیر کتاب ہذا کے ص ۲۵۰ پر ملاحظہ فرمائیے۔

کرایا تھا۔ اس لیے انہیں باوگر بھی کہتے ہیں۔ ہنود کے قدیم وید شاستر کی انہیں خوب واقفیت تھی۔ اس لیئے پیر صدرالدین، پیرشمس، اور سوہ دیو یعنی بڑے درویش کے نام سے بھی مشہور ہیں (نور مبین ص۴۸۷-۴۸۸ مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند بمبئی)

مندرجہ بالا اقتباس بار بار پڑھیئے اور دیکھئے کہ ہمارے اولیاء اللہ اور پیر جو ہندوؤں کو مسلمان بناتے تھے۔ تو وہ کس قسم کا اسلام ہوتا تھا مسجد کے بجائے جماعت خانے بنائے جاتے تھے۔ جن میں ایسے نومسلم اکٹھے ہوتے تھے۔ جہاں بالادستی ہندوؤں کی ہی ہوتی تھی۔ مکھی دراصل جماعت خانے کا بڑا منتظم ہوتا ہے جو پنجاب کی جماعت کا بھی ہندو تھا اور کشمیر کی جماعت کا بھی، اور غالباً سندھ کا مکھی بھی ہندو ہی تھا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بہتر نہ ہوگا کہ ہمارے اولیاء اللہ اور پیر ہندوؤں کو مسلمان نہیں بناتے تھے۔ بلکہ خود بھی ہندو بن جاتے تھے۔ جیسا کہ صدرالدین، ہریش چندر یا سوہ دیو (بڑا درویش) کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ -

برِصغیر میں مندرجہ بالا اوصاف سے متصف طرز کی اشاعتِ اسلام کرنے والے مندرجہ ذیل صوفیائے کے نام قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ معین الدین چشتی سجزی اجمیری (م ۶۳۳ھ) ۲۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۳۴ھ)
۳۔ مخدوم علاؤ الدین صابر کلیری (م ۶۹۰ھ) ۴۔ بابا فرید گنج شکر (م ۶۶۴/۶۶۸ ھ)
۵۔ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی (م ۷۵۷ھ) ۶۔ شیخ نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ھ)
۷۔ بہاؤ الدین زکریا ملتانی (م ۶۶۷ھ) ۸۔ سید محمد گیسو دراز (م ۸۲۵ھ)
۹۔ شیخ رکن الدین ابوالفتح ملتانی (م ۷۳۵ھ) ۱۰۔ شیخ صدر الدین عارف (م ۶۸۴ھ)
۱۱۔ شیخ جلال الدین تبریزی (م ۶۴۲ھ) ۱۲۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت (م ۷۸۵ھ)
۱۳۔ بوعلی قلندر (م ۷۲۴ھ) ۱۴۔ سید محمد غوث گیلانی قادری (م ۹۲۳ھ)
۱۵۔ پیر صدرالدین (م ۸۱۹ھ) ۱۶۔ لال شہباز قلندر
۱۷۔ منگھو پیر المعروف مگرمچھ پیر (ہندو انہیں لالہ جے راج کے نام سے مانتے تھے)۔

چونکہ یہ بزرگ صوفیاء موجودہ حکومت کے وفادار ہوتے تھے اور کسی بھی غیر شرعی حکومت کے خلاف علم جہاد بلند کرنا اُن کی تعلیمات سے خارج تھا۔ لہٰذا یہ گروہِ صوفیاء سلاطین وقت کا ہمیشہ سے منظورِ نظر رہا ہے۔ سلاطین وقت اُن کا اسی وجہ سے احترام کرتے، اُن کے آستانوں اور مزاروں پر حاضر ہوتے اور اُن کی خانقاہوں کے لئے جاگیریں وقف کر دیا کرتے تھے۔ تاکہ یہ حضرات اُن کی حکومتوں کو مضبوط و مستحکم بنانے کے سلسلہ میں موثر کردار

ادا کرتے رہیں اور قوم کو اسی طرح کے اشغال میں مصروف و منہمک رکھیں تاکہ سیاسی صورتحال میں مداخلت کی طرف انہیں بھولے سے خیال بھی نہ آسکے۔ مزارات اور خانقاہوں کے ساتھ جاگیروں کا الحاق آج بھی اس حقیقت کا زندہ ثبوت مہیا کر رہا ہے۔

ابتداء میں کچھ صوفیاء ایسے بھی تھے جو سرکاری درباروں میں آمد و رفت کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ البتہ ان کے عطا کردہ وظائف اور جاگیریں قبول فرما لیا کرتے تھے مگر بعد میں آنے والے بزرگوں نے یہ ریت بھی ختم کر دی اور سرکاری درباروں سے باقاعدہ مراسم بھی شروع کر دیئے۔

۱۱۔ صوفیاء کی تعلیم و تربیت کا ردِ عمل (بھگتی تحریک)

اب ہندوؤں نے یہ سوچا کہ اگر مسلمان فقیر اور بزرگ اپنی خانقاہوں میں ہندوؤں کو رکھ سکتے ہیں تو آخر ہم اپنے تیرتھوں میں مسلمانوں کو کیوں نہیں رکھ سکتے۔ پھر چند باتیں ایسی بھی تھیں جو ان سب مذاہب میں مشترک تھیں، مثلاً:

۱۔ اگر مسلمان صوفیاء اتحاد و حلول کے قائل تھے تو ہندو رشی منی، سادھو، سنت بھی اسی اتحاد و حلول کے قائل تھے۔

۲۔ اگر مسلمان فقیر کرامات دکھلا سکتے تھے تو اس طرح کی کرامات جوگیوں اور رشیوں منیوں کے ہاں بھی موجود تھیں۔

۳۔ ہندو اپنے دیوی دیوتاؤں کی (جو اُن کے بزرگوں کے مجسمے ہوتے تھے) حیاتِ جاودانی تسلیم کرتے تھے۔ جبکہ مسلمان اپنے فوت شدہ بزرگوں کی حیاتِ جاودانی کے قائل تھے اور جہاں تک حاجت روائی اور مشکل کشائی کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں بھی دونوں یکساں تھے۔ ہندو اپنے دیوی دیوتاؤں کے سامنے نذر و نیاز پیش کرتے اور مرادیں مانگتے تھے، تو مسلمان بھی یہی کام اپنے بزرگوں کی قبروں اور آستانوں سے لے لیا کرتے تھے۔ اس طرح غیر اللہ سے حاجت روائی اور مشکل کشائی پر بھی دونوں کا اتحاد ہو جاتا ہے اور مسلمان بزرگوں نے انہیں یہ سمجھایا تھا کہ اگر نذر و نیاز اور مرادیں دیوی دیوتاؤں کے سامنے پیش کی جائیں تو یہ عین شرک ہے مگر وہی کام اگر قبروں پر سرانجام دے لئے جائیں تو اس سے توحیدِ الٰہی میں چنداں خلل نہیں پڑتا۔

البتہ ایک بات مابہ انزاع ضرور تھی اور وہ تھی ذات پات کی تمیز۔ جس کا اسلام میں کوئی تصور نہ تھا اور فی الحقیقت فرد تر ہندو طبقہ کو اسلام کی طرف مائل کرنے والی یہی چیز تھی۔

اب ہندوؤں نے یہ سوچا کہ اگر ہم ذات پات کی تمیز کو ختم کر دیں تو ہم مسلمان صوفیاء کی اس اشاعتِ اسلام کا سدِباب کر سکتے ہیں۔ رہی صوفیاء کی توحیدِ الٰہی تو ایسی توحید جس میں صرف یہ فرق ہو تو بتوں، دیوی دیوتاؤں کے بجائے قبروں کے بزرگوں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے تو ایسی توحید انہیں بھی گوارا تھی۔ چنانچہ ہندوؤں کے کچھ پیروں فقیروں نے کمر ہمت باندھی اور بھگتی تحریک کے نام سے اس مشن کا آغاز کیا گیا۔ چند ایک ایسے ہندو اولیاؤں کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:

۱۔ رامانج

یہ بھگتی تحریک کے بانی ہیں ۱۰۱۶ء عیسوی میں مدراس کے ایک نواحی گاؤں میں ایک برہمن کے گھر پیدا ہوئے (یاد رہے کہ پہلے بزرگ صوفی شیخ اسمٰعیل بخاری ۱۰۰۵ء میں برصغیر میں وارد ہوئے تھے) وہ وحدانیت کے حامی تھے۔ آپ کے نزدیک برہما اور ایشور ایک ہی ہے اور وہی روح اعظم ہے اس کی ذات وصفات میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ ہر فعل سے مبرا ہے۔ اسی سے روح اور مادہ نکلتے ہیں۔ روح خدا کو صرف بھگتی (ریاضتِ شاقہ) سے حاصل کر سکتی ہے۔ پہلی منزل ادائے فرض ہے، دوسری منزل ریاضت ہے اور تیسری بھگتی۔ یعنی آپ نے شریعت و طریقت دونوں کی پابندی کو اصلی عبادت اور باعثِ نجات قرار دیا اگرچہ آپ ذاتوں کی تقسیم کے قائل تھے، لیکن آپ نے شودروں اور چنڈالوں کے حقِ عبادت کو تسلیم کیا۔

۲۔ سوامی رامانند

۱۲۹۹ء میں الٰہ آباد میں ایک برہمن کے ہاں پیدا ہوئے۔ رامانج کے پانچویں خلیفہ تھے۔ انہوں نے اپنے گرو (روحانی پیشوا) کے بعد اگلا قدم یہ اٹھایا کہ ذات پات کی بھی سخت مخالفت کی اور زبانِ سنسکرت کو بھی ترک کر کے عام زبان میں وعظ کرتے۔ ہر ذات کے لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوتے۔ انہوں نے تمام تیرتھوں کا سفر کیا۔ رامچندر اور سیتا جی کو وشنو کا مظہر (اوتار) قرار دے کر ان کی پوجا کو رواج دیا۔ ان کے ۱۲ چیلے (خلفاء) بڑے مشہور ہیں۔

۳۔ سوامی ولبھ اچاریہ

دکن کے ایک برہمن کے ہاں ۱۴۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ کم عمری میں ہی علم وفضل میں کمال حاصل کیا۔ کرشن جی کو وشنو کا اوتار قرار دیتے تھے۔ ولبھ اچاریہ نے ریاضت نفس کشی اور ترکِ دنیا کی تعلیم دی۔ وہ بھگتی (مجاہدہ وریاضت) کو دولت کے جال سے نکلنے کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک کرشن اور رادھا کی محبت میں شریک ہونا دائمی مسرت اور بھگتی کا آخری مقصد تھا۔

۴۔ سوامی جے تنیہ بنگال کے ایک برہمن کے ہاں ۱۴۸۵ء میں پیدا ہوئے ۲۵ برس کی عمر میں تارک الدنیا ہو کر سنیاسی بن گئے۔ بھگتی کے مشہور پرچارک تھے۔ ملک بھر میں دورہ کر کے پریم اور شانتی کا پرچار کرنے لگے۔ ان میں بلا کی کشش و جاذبیت تھی۔ ان کی تعلیم تھی کہ کرشن ہر آتما میں موجود ہے۔ اس لئے ہر ذی رُوح سے محبت کرو۔ وہ ذات پات کی تمیز کے قائل نہیں تھے۔ اچھوتوں اور چنڈالوں کو گلے لگا لیا کرتے تھے۔ آج تک لاکھوں ہندو انہیں سری کرشن کا اوتار (مظہر) مانتے ہیں۔

۵۔ بھگت کبیر ۱۴۴۰ء میں ایک برہمن بیوہ کے ہاں پیدا ہوئے جو انہیں بنارس کے ایک تالاب کے کنارے چھوڑ گئی۔ وہاں سے نیرو نامی ایک جولاہا اٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ نیرو اور اس کی بیوی نے انہیں اپنا متبنّٰی بنا لیا اس طرح بھگت کبیر نے ایک مُسلم گھرانے میں پرورش پائی۔ وہ رامانند کے چیلوں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ تذکرہ اولیائے ہند میں ان کا نام شیخ کبیر مرقوم ہے۔ انہوں نے اسلامی تصوّف کے خیالات بھیکا چشتی اور شیخ تقی سہروردی اور ہندو ویدانت کے تخیلات رامانند سے سیکھے اور دونوں قوموں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ وہ وحدانیت کے علمبردار اور بُت پرستی کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے ذات پات کی تمیز اور چھوت چھات کو گمراہ کُن قرار دیا اور عرفان یا معرفتِ الٰہی پر بہت زور دیا۔ ان کی پاکیزہ تعلیمات کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے لوگ ان کے مُرید تھے۔ ہندو انہیں کبیر پنتھی اور مسلمان انہیں شیخ کبیر کہتے تھے۔ اسرارِ معرفت اور حقائقِ زندگی سے معمور ان کے سادہ اور دلآویز دوہے آج بھی برِصغیر کی ادبی میراث کا ایک انمول حصہ ہیں۔

۶۔ باباگورونانک ۱۴۶۹ء میں ضلع شیخوپورہ کے ایک قصبہ تلونڈی (ننکانہ صاحب) میں پیدا ہوئے۔ ۳۰ سال کی عمر میں تارک الدنیا ہو کر دُور دُور کے ممالک کی سیاحت اور وہاں کے تیرتھوں، خانقاہوں اور مقدس مقامات پر جا کر سادھوؤں، سنتو یوں کی صحبت سے استفادہ کیا۔ پھر اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی اور بھگت کبیر کے انداز پر نہ صرف ذات پات بلکہ اختلاف مذاہب کی بھی مخالفت کی۔ آپ کے خیالات پر اسلام کا گہرا اثر تھا۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں مسلمانوں کی مذہبی کُتب اور متصوفانہ خیالات سے بہت استفادہ کیا۔ چنانچہ آپ کے خیالات میں اسلامی تصوّف کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی وسیع المشرب تعلیمات نے آگے چل کر سکھ مت کی شکل اختیار کر لی۔ اگرچہ مُسلم حکومت سے سکھوں کا تصادم بھی ہوا لیکن سکھ آج تک توحید پرستی کے قائل بُت پرستی کے دشمن ہیں۔ ان کی عبادت و ریاضت اور اوراد و وظائف کے طریقے بڑی حد تک مسلمانوں سے

ملتے جلتے ہیں۔ آپ نے ۱۹۳۸ء میں کرتار پور کے مقام پر وفات پائی۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں ہم نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے اضافہ نہیں کیا البتہ اختصار ضرور کیا ہے اور یہ سب اقتباسات تاریخ پاک و ہند مصنفہ عبداللہ ملک سے لئے گئے ہیں۔ اب آپ خود ہی ملاحظہ فرمالیجئے کہ مسلمان صوفیوں اور ہندو سادھوؤں اور سنتوں کے طریق تعلیم و تربیت میں کس قدر یگانگت تھی وہی ترک دنیا، وہی ریاضت و مجاہدات، وہی اتحاد و حلول کے عقیدے، وہی اسرار معرفت اور عرفان الٰہی کے سبق، ایک ہی قسم کے اوراد و وظائف کے طور طریق، خانقاہوں اور تیرتھوں میں یکساں طریق تربیت۔ اگر کچھ فرق ہے تو ناموں کا۔ اسی حقیقت کو کسی مسلمان صوفی شاعر نے یوں بیان کیا کہ

ملتِ عشق از ہمہ ملت جدا ست　　عاشقاں را مذہب و ملت خدا ست

اور عبدالغفور عرشی صاحب اپنی کتاب ریاض السالکین کے صفحہ ۲۵۶ پر لکھتے ہیں:

ہو گیا میں بری جور و جفا سے نہ خیال ثواب و عذاب رہا　　نہ تو مسلم رہا نہ ہی کافر رہا، سوا عشق کے میرا ایمان نہ رہا

اور کسی دریدہ دہن شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

درمذہب عاشقاں یک رنگ　　ابلیس و محمد ہست ہم سنگ

یعنی عاشقوں کے مذہب میں ابلیس لعین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم سنگ و ہم وزن ہیں۔ نعوذ باللہ من ذٰلک الخرافات۔ (تذکرہ غوثیہ، ص ۲۵۵ بحوالہ رضا خانی مذہب، ص ۹۳)

پھر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ مندرجہ بالا امور میں سے کوئی بات بھی تعلیمات اسلامیہ سے مطابقت نہیں رکھتی اور ایسا ہی اسلام ہمارے صوفیائے کرام نے برصغیر پاک و ہند —— اور اسی طرح بعض دوسرے ممالک —— میں پھیلایا تھا۔ گو آج کا مسلمان ان حقائق سے کسی حد تک آگاہ ہو چکا ہے اور پیری مریدی کے سلسلہ کا پہلا سا دم خم نہیں رہا۔ اور بعض حقیقت پسند صوفیہ نے ایسے باطل عقاید پر کڑی تنقید بھی کی ہے۔ تاہم خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ابھی ایسے باطل افکار و نظریات اور عقائد و اعمال کو دور کرنے میں ابھی مزید کتنی مدت درکار ہو گی۔

WWW. DEENEKHALIS.COM
WWW. RAHEHAQ.COM

باب (۸)

مُعجزات، کرامات اور استدراج

مُعجزہ کی غرض اور اقسام

معجزہ اور کرامت میں فرق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر کسی خرق عادت بات کا ظہور کسی نبی کی ذات سے ہو تو وہ معجزہ ہے اور اگر کوئی ایسی بات یا واقعہ کسی ولی سے صادر ہو تو وہ کرامت ہے۔ لہٰذا کرامت کا صحیح مفہوم متعین کرنے سے پہلے معجزہ اس کی حقیقت اور اقسام کو سمجھنا ضروری ہے۔ معجزہ کی بڑی اقسام دو ہیں جو درج ذیل ہیں :

۱۔ ایسا معجزہ جو کسی نبی کو اس کی نبوت کی دلیل کے طور پر عطا کیا جاتا ہے۔ پھر اس کی بھی دو ذیلی اقسام ہیں :

(ا) ایسے معجزات جن کی حیثیت کسی حد تک دائمی ہوتی ہے اور نبی کو جب ضرورت پیش آتی ہے وہ ایسا مُعجزہ دِکھلا سکتا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے دو مُعجزے عطا ہوئے تھے۔ (۱) لاٹھی کا سانپ بن جانا اور (۲) یدِ بیضا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا اور جنات پر حکومت کرتے تھے۔ نیز پرندوں کی بولیاں سُن اور سمجھ سکتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں میں لوہا موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔

انبیاء علیہم السلام کو اپنی نبوت کا دعویٰ پیش کرنا فرض ہوتا ہے۔ لیکن اولیاء اللہ کو اپنی ولایت کا دعویٰ تو دُور کی بات ہے۔ اس کا چھپانا بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا اولیاء اللہ کو اس دائمی قسم کی کرامات کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

(ب) ایسے معجزات، جو ہوتے تو نبوت کی دلیل کے طور پر ہیں، لیکن اُن کی حیثیت عارضی اور وقتی ہوتی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کا گلزار بن جانا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پتھر پر لاٹھی مارنا اور چشموں کا

پھوٹ نکلنا یا سمندر پر لاٹھی مارنا اور درمیان میں خشک راستہ بن جانا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور وفات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج اور انشقاقِ قمر وغیرہ اسی قبیل سے ہیں۔ نبی کو ایسے واقعات کا نہ پہلے سے علم ہوتا ہے، نہ اُن کے متعلق کوئی دعویٰ کر سکتا ہے۔

ج۔ ایسے معجزات جن کا خود کفار کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ایسے معجزات کبھی تو اللہ تعالیٰ عطا کر دیتے ہیں۔ جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے مطالبہ پر پہاڑ میں سے حاملہ اونٹنی برآمد ہوئی اور کبھی یہ مطالبہ اللہ تعالیٰ منظور نہیں فرماتے۔ جیسے کفارِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ آپ کے لئے یا تو سونے کا گھر ہو یا عمدہ قسم کا باغ ہو یا ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ کر کتاب لاؤ، وغیرہ۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ مطالبات تسلیم نہیں کئے اور نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معجزات عطا فرمائے۔ اس قسم کے معجزات میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اگر کفار کے مطالبہ پر کسی نبی کو کوئی ایسا معجزہ دیا جائے اور وہ پھر بھی ایمان نہ لائیں، تو اُن پر عذابِ الیم نازل ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے آپ کو اس قسم کے معجزات عطا نہیں کئے گئے [اور اس طرح کی کرامات کی اولیاء اللہ کو بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

۲۔ ایسے معجزات جو کسی اہم دینی یا دنیوی غرض کو پورا کرنے کے لئے عطا کئے جاتے ہیں۔ اور اس قسم کے بکثرت معجزات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کئے گئے تھے۔ مثلاً جنگِ بدر میں آپ کا مٹھی بھر ریت کفار کی طرف پھینکنا۔ جس کو اللہ نے کفار کی آنکھوں تک پہنچا دیا اور وہ اندھے ہو گئے اور بالآخر شکست کھائی یا مثلاً دورانِ جہاد لشکرِ اسلامی سخت پیاسا ہو گیا۔ اور پانی کے آثار کہیں نظر نہ آتے۔ تو آپ نے پانی کے پیالہ میں اپنا دستِ مبارک ڈالا تو انگلیوں سے پانی کے سوتے پھوٹنے لگے۔ اور اس پیالہ سے سارا اسلامی لشکر سیراب ہو گیا۔ پھر بھی پانی ختم ہونے کو نہ آتا تھا (جیسا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لئے چشمہ زمزم اور حضرت مریم علیہا السلام کے لئے ایک چھوٹی سی نہر جاری ہو گئی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور کا دوسرا واقعہ بھی دورانِ جہاد اور پیاس سے متعلق ہے۔ آپ نے ایک خشک اور دُبلی سی بکری پر ہاتھ پھیر کر اتنا دودھ دوہ لیا کہ اس سے آپ اور آپ کے سب صحابہ سیراب ہو گئے۔ جنگِ خندق کے دوران جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی تمام صحابہ بھی مشقت کرتے تھے اور کھانے کو کچھ نہ ملتا تھا اور سب بھوک سے نڈھال اور پیٹوں پر پتھر باندھے ہوئے تھے، تو اس دوران کسی صحابی نے صرف آپ کی دعوت کی۔ تو آپ نے چولہے پر رکھی ہنڈیا اور آٹا گوندھتے وقت آٹے میں اپنا لعابِ مبارک شامل کر دیا جس سے اتنی برکت ہو گئی کہ تمام مجاہدین نے سیر ہو کر کھانا

کھالیا۔ اس قسم کے واقعات اللہ کی طرف سے ہوتے اور برکت سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے کسی نہ کسی صورت میں تھوڑی بہت چیز موجود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ضرورت کے مطابق اس میں نبی کی دعا سے برکت ڈال دیتے ہیں۔ آپ کے بیشتر معجزات اسی قبیل سے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے۔ غزوہ تبوک کے دوران جب صحابہؓ کی رسد ختم ہونے لگی، تو آپؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اُدْعُھُمْ بِفَضْلِ اَزْوَادِھِمْ ثُمَّ	اے اللہ کے رسول! لوگوں سے کہئے کہ بچا کھچا راشن لائیں۔
اُدْعُ اللّٰہَ لَھُمْ عَلَیْھَا بِالْبَرَکَۃِ فَقَالَ نَعَمْ. فَدَعَا	پھر اس پر آپ برکت کی دعا فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا:
بِنِطَعٍ فَبُسِطَ ثُمَّ دَعَا بِفَضْلِ اَزْوَادِھِمْ. فَجَعَلَ	"ٹھیک ہے۔" آپ نے ایک چمڑے کا دسترخوان منگوایا۔
الرَّجُلُ یَجِیْئُ بِکَفِّ ذُرَۃٍ وَیَجِیْئُ الْاٰخَرُ بِکَفِّ	جو پھیلا دیا گیا۔ پھر لوگوں کو بچا کھچا راشن لانے کو کہا تو کوئی مٹھی بھر
تَمْرٍ وَیَجِیْئُ الْاٰخَرُ بِکِسْرَۃٍ حَتّٰی اجْتَمَعَ عَلَی	چنے لاتا، کوئی مٹھی بھر کھجور اور کوئی روٹی کے ٹکڑے۔ حتیٰ کہ
النِّطَعِ شَیْئٌ یَسِیْرٌ فَدَعَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ	دسترخوان پر جو سامان جمع ہوا وہ تھوڑا ہی تھا۔ پھر آپ نے اس
عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْبَرَکَۃِ فَقَالَ: خُذُوْا فِیْ	پر برکت کی دعا فرمائی۔ پھر فرمایا: اپنے اپنے برتن بھر کر لیتے جاؤ
اَوْعِیَتِکُمْ فَاَخَذُوْا فِیْ اَوْعِیَتِھِمْ حَتّٰی	لوگ برتن بھر بھر کر لے جانے لگے۔ حتیٰ کہ لشکر میں کوئی ایسا
مَا تَرَکُوْا فِی الْعَسْکَرِ وِعَاءً اِلَّا مَلَئُوْہُ قَالَ	برتن نہ رہا جس کو بھرا نہ گیا ہو۔ (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ
فَاَکَلُوْا حَتّٰی شَبِعُوْا وَ	راوی) کہتے ہیں کہ پھر سارے لشکر نے سیر ہو کر کھایا مگر پھر
فَضَلَتْ فَضْلَۃٌ (بخاری کتاب الجہاد والسیر باب حمل الزاد.....)	بھی خوراک بچ رہی۔

یا پھر ایسے معجزات ملتے ہیں مثلاً ہجرت کے وقت سراقہ کا گھوڑا دھنس گیا۔ غارِ ثور کے منہ پر مکڑی نے جالا تن دیا۔ رکانہ پہلوان نے آپ کو کشتی کی دعوت دی، تو آپؐ نے اسے تین بار پچھاڑ دیا۔ یہ سب واقعات و معجزات کوئی نہ کوئی غرض پوری کر رہے ہیں پیغمبر کو پہلے سے اس قسم کے معجزات کے صدور کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ اور معجزات یا خرق عادت امور کی یہی قسم ہے جس کا صدور اولیاء سے ممکن ہے اور یہ کرامت کہلاتی ہے۔

کرامت کا مفہوم

کرامت کے لفظی معنی "بزرگی" ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ کبھی کبھار کسی بزرگ سے ایسا واقعہ صادر ہو جائے جو عام حالات میں ناممکن ہو۔ مثلاً ایک پہلوان ہے۔ جو پانچ من وزن اٹھا سکتا ہے وہ اگر کسی وقت پانچ من کا وزن اٹھا لے تو یہ اس کی کرامت

نہیں۔ البتہ ایک ایسا شخص جو صرف ایک من بوجھ اٹھانے کی قوت رکھتا ہے اگر وہ کسی وقت اللہ کی مہربانی سے کسی معرکہ، مقابلہ یا ضرورت کے وقت پانچ من کا بوجھ اٹھا لے تو یہ کرامت ہوگی۔ حضور اکرم ﷺ نے رکانہ پہلوان کو تین بار مقابلہ میں پچھاڑ دیا۔ یا جنگِ خندق کے موقع پر ایک ایسے پتھر کو توڑ دیا جسے کئی صحابہ مل کر بھی نہ توڑ سکے، تو یہ معجزہ تھا۔ اور اگر یہی واقعہ کسی دوسرے بزرگ سے واقع ہو تو کرامت کہیں گے۔

انہی واقعات سے مسئلہ علمِ غیب اور تصرف فی الامور کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ سب باتیں کسی نبی یا ولی کی ذات کا خاصہ ہرگز نہیں۔ اللہ اگر چاہے تو کسی خاص موقع پر نبی کو وحی کے ذریعہ اور ولی کو الہام کے ذریعہ مطلع کر دے تو یہ اس کی مہربانی ہے۔ نہ کرے تو بھی اس کی مرضی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو مطلع کر دیا کہ ایک عورت حاطب بن ابی بلتعہ کا رقعہ لے کر مکہ کو جا رہی ہے۔ مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے افک کے موقع پر آپ پورے ایک ماہ پریشان رہے اور وحی نہ ہوئی۔ حضرت یعقوب کو مصر سے روانہ ہونے والے کی خوشبو تو آ گئی۔ مگر کنعان ہی کے ایک کنویں میں پڑے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی میں ہلکان ہوئے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا۔ تو ایسے واقعات کبھی کبھار پیش آتے ہیں روزانہ معمول کی بات نہیں ہوتی۔ چنانچہ پورے دورِ صحابہ کرام ایسی کرامات کی دس بارہ سے زیادہ مثالیں نہیں ملتیں۔ اب دیکھئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ چوبیس ہزار کے لگ بھگ تھی، جو وہاں موجود تھے اور وفاتِ نبویؐ کے وقت صحابہ کی کل تعداد چار لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ پھر یہ دورِ صحابہ بھی پوری ایک صدی یعنی ۱۱۰ھ تک پھیلا ہوا ہے مگر ایسے واقعات صرف دس بارہ ہیں۔ پھر ان میں سے بھی بعض کی صحت محلِ نظر ہے۔ صحاح ستہ میں صحابہ کی کرامات علیحدہ عنوان کے تحت مذکور نہیں خطیب بغدادی نے آٹھویں صدی میں مشکوٰۃ المصابیح کو مرتب کیا، تو اس میں علیحدہ باب الکرامات کا اندراج کیا۔ یہ کل بارہ واقعات ہیں جو حدیث کی درجہ اول، دوم، سوم، چہارم سب قسم کی کتابوں سے اکٹھے کیے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ اول درجہ کی کتب بخاری اور مسلم ہیں۔ دوم درجہ کی باقی صحاح ستہ کی چار کتابیں۔ باقی کتب احادیث کی روایات علیٰ قدر مراتب سوم اور چہارم درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ درجہ سوم اور چہارم کی بیشتر احادیث ناقابلِ اعتماد و احتجاج ہیں۔ اب جو بارہ واقعات مشکوٰۃ میں درج ہیں۔ ہم انہیں انہی درجات کی ترتیب سے یہاں پیش کر رہے ہیں۔

٭٭٭

کراماتِ صحابہ

اوّل درجہ کی کتب سے

(۱) عبدالرحمن بن ابوبکر ؓ راوی ہیں کہ اصحابِ صفّہ فقیر لوگ تھے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس دو شخصوں کا طعام ہو وہ تیسرے کو بھی لے جائے اور جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو وہ پانچویں بلکہ چھٹے کو بھی لے جائے۔ سو حضرت ابوبکر ؓ تو تین شخصوں کو لائے اور رسول اللہ ﷺ دس شخصوں کو لے گئے۔ حضرت ابوبکر ؓ نے رات کا کھانا رسول اللہ ﷺ کے ہاں کھایا۔ پھر عشاء کی نماز آپ کے ساتھ پڑھی۔ نماز کے بعد پھر رسول اللہ ﷺ کے گھر آئے اور رسول اللہ ﷺ نے کھانا کھایا۔ پھر کافی رات گئے گھر آئے تو بیوی نے کہا مہمانوں کا پتہ نہیں۔ آپ نے پوچھا "انہوں نے ابھی کھانا نہیں کھایا"۔ بیوی نے کہا "وہ کہتے تھے جب تک آپ نہ آئیں گے ہم کھانا نہ کھائیں گے۔" اس بات سے حضرت ابوبکر ؓ رنجیدہ ہو گئے اور کہا کہ میں تو کبھی کھانا نہ کھاؤں گا۔ پھر بیوی نے بھی اور اسی طرح مہمانوں نے بھی کھانا نہ کھانے کی قسم اٹھائی۔ تب حضرت ابوبکر ؓ کہنے لگے یہ تو شیطان کا کام ہے۔ آپ نے کھانا منگا کر کھانا شروع کیا اور مہمانوں نے بھی کھایا۔ ہوتا یہ تھا کہ جتنا کھانا وہ کھاتے اُس سے زیادہ نیچے سے اُبھر آتا تھا۔ حضرت ابوبکر ؓ نے اپنی بیوی سے کہا "اے بنو فراس کی بہن ! یہ کیا ؟" بیوی کہنے لگی۔ "میری آنکھوں کی ٹھنڈک ! یہ کھانا پہلے سے تین گنا زیادہ ہو گیا ہے۔" پس اِن سب نے کھانا کھایا۔ پھر اس میں سے رسول اکرم ﷺ کو بھی بھیجا۔ روایت کیا گیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے بھی اس کھانے میں سے کھایا۔

اس باب مندرج ۱۲ روایات میں سے سب سے معتبر روایت یہی ہے جو کھانے میں برکت سے تعلّق رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ روایت بخاری و مسلم دونوں نے روایت کی ہے۔ اب یہ برکت مہمانوں کی وجہ سے تھی۔ یا حضرت ابوبکر ؓ کی وجہ سے یا آپ کی بیوی کی وجہ سے یا خود رسول اللہ ﷺ کی ذات کی وجہ سے ؟ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کرامت کو کسی خاص ایک شخص سے منسوب کرنا بھی مشکل ہے اور قرینِ قیاس بات یہ ہے کہ یہ برکت ہر ایک کے خلوص کی وجہ سے اجتماعی شکل میں صادر ہوئی تھی۔

۲۔ عروہ بن زبیر ؓ کہتے ہیں کہ ایک عورت اروی بنتِ اوس نے سعید بن زید بن عمرو بن نفیل

سے جھگڑا کیا اور مروان بن حکم (گورنر مدینہ) کے پاس دعوےٰ کر دیا کہ سعید نے میری زمین کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ سعید بن زیدؓ کہنے لگے۔ "میں کیسے قبضہ کر سکتا ہوں جبکہ میں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔" مروان نے کہا: "آپؓ نے رسول اللہ ﷺ سے کیا سنا ہے؟" حضرت سعید رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ "جس شخص نے ازراہِ ظلم کسی کی ایک بالشت زمین پر قبضہ کر لیا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سات زمینوں تک اس کے گلے کا طوق بنا دے گا۔" مروان کہنے لگا: "میں اب یہ سننے کے بعد تجھ سے ثبوت کا مطالبہ نہیں کرتا۔" حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کہنے لگے "یا اللہ! اگر یہ عورت جھوٹی ہے تو اس کی بینائی کو اندھا کر اور اس کی زمین میں اسے موت دے۔" حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ (راوی) کہتے ہیں کہ وہ عورت فی الواقع اندھی ہو گئی۔ ایک دن جب وہ اپنی زمین میں چل رہی تھی تو ایک گڑھے میں گر کر مر گئی (متفق علیہ) اور مسلم میں محمد بن زید بن عبداللہ بن عمرؓ سے اسی مضمون کی روایت ہے کہ انہوں نے اس عورت کو دیکھا کہ اندھی ہو گئی تھی۔ دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر چلتی اور کہتی تھی کہ "مجھے سعید کی بددعا لگ گئی۔" اس کے گھر میں ہی ایک کنواں تھا اور اسی جگہ کے لیے اس نے جھگڑا کیا تھا وہ اس میں گر گئی اور وہ اس کی قبر بن گیا۔"

یہ روایت متفق علیہ ہونے کی وجہ سے معتبر ضرور ہے لیکن یہ اصطلاحی معنوں میں کرامت ہے ہی نہیں۔ مقدمہ یا جھگڑا کے درمیان ظالم یا مظلوم کی بددعا ہے۔ جیسا کہ لعان کی صورت میں بھی ہوتی ہے اور ایسی بددعا بسا اوقات اپنا رنگ دکھلاتی ہے۔

(۳) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب جنگِ اُحد کا وقت آیا تو میرے باپ نے رات مجھے بلایا اور کہا مجھے یُوں گمان ہوتا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں پہلے پہلے شہید ہو جانے والوں میں سے ہوں گا اور رسول اللہ ﷺ کی ذات کے بعد تم سب سے زیادہ میرے عزیز ہو اور دیکھو! مجھ پر قرضہ ہے اسے ادا کرنا اور اپنی بہنوں سے بہتر سلوک کی میں تمہیں وصیت کرتا ہوں۔" پھر جب جنگ شروع ہوئی تو میرا باپ پہلا شہید تھا جسے میں نے ایک اور شہید کے ساتھ قبر میں دفن کیا۔ (بخاری)

یہ روایت معتبر ہے لیکن یہ بھی معروف معنوں میں کرامت نہیں۔ یہ تو ایک مومن کی شہادت کی آرزو ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پورا فرما دیا۔

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اسید بن حضیرؓ اور عباد بن بشیرؓ ایک دفعہ اپنی کسی ضرورت کے

سلسلہ میں رات گئے تک رسول اللہ ﷺ سے باتیں کرتے رہے۔ جب جانے لگے تو رات گھُپ اندھیری تھی۔ جب گھروں کو روانہ ہونے لگے تو ان دونوں کے ہاتھوں میں ایک ایک لاٹھی تھی۔ ان دونوں میں سے ایک کی لاٹھی روشن ہوئی۔ جس کی روشنی میں دونوں چلنے لگے اور جہاں دونوں کا راستہ جدا ہوتا تھا تو دوسرے کی بھی لاٹھی روشن ہو گئی۔ جس کی لَو میں وہ چلنے لگا۔ یہاں تک کہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ (بخاری)

یہ روایت معتبر اور صحیح معنوں میں کرامت یا معجزہ ہے۔ اگر تو یہ رسول اللہ ﷺ کی برکت یا دُعا سے ہوا تھا تو یہ معجزہ تھا۔ ورنہ یہ فی الواقعہ کرامت تھی جو ایک اہم ضرورت پُوری کر رہی تھی اور اقرب الی الحق یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ آپؐ کا معجزہ تھا۔

دوسرے درجہ کی روایات

(۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "جب نجاشی (شاہِ حبشہ) مر گیا تو ہم سے لوگ بیان کرتے تھے کہ نجاشی کی قبر پر ہمیشہ نُور نظر آتا ہے۔" (ابوداؤد)

ابوداؤد کی یہ روایت معتبر ہے لیکن اس میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب نجاشی کا اسلام لانا ہی محلِ نظر ہے، تو یہ کرامت کیسے ہوئی۔ دوسرے یہ لوگوں کی باتیں ہیں۔ جن کا تعلق زیادہ حسن ظن سے تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نہ اس بات کی تصدیق کرتی ہیں نہ تکذیب۔

(۶) ابُو خلدہ (تابعی)، کہتے ہیں کہ میں نے ابُوالعالیہ سے کہا، "کیا حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے حدیثیں سنی ہیں؟" تو ابوالعالیہ کہنے لگے کہ "حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بارہ سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی اور رسول اللہ نے اُن کے حق میں دُعا فرمائی۔ اُن کا ایک باغ تھا جو سال میں دو بار پھل لاتا اور اس باغ سے کستوری کی خوشبُو کی طرح خوشبو آتی تھی۔" اسے ترمذی نے روایت کیا اور کہا کہ یہ حدیث "حسن غریب ہے۔"

یہ حدیث ایک تو صحیح حدیث کے تقاضے پورے نہیں کرتی۔ امام ترمذی جس حدیث کو حسن غریب کہہ دیں وہ عموماً ناقابلِ احتجاج ہی ہوتی ہے۔ دوسرے اگر یہ صحیح بھی تصور کر لی جائے تو یہ رسول اللہ ﷺ کی دُعا کا نتیجہ اور برکت ہے۔ اس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی کیا کرامت ہے؟ یہ ہمیں سمجھ نہیں آئی۔

تیسرے اور چوتھے درجہ کی روایات

یہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ صحاحِ ستہ کے بعد باقی کتبِ احادیث کی روایات میں سے بیشتر ناقابلِ اعتماد

اور ناقابلِ احتجاج ہیں اور جو روایات واقعی صحابہ کی کرامات ثابت کرتی ہیں وہ کچھ اسی قسم کی ہیں مثلاً:

(۷) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب صحابہؓ نے آپ کو غسل دینا چاہا، تو صحابہؓ کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آپؐ کو ایسے ہی ننگا کر کے غسل دیا جائے، جیسے دُوسروں کو دیا جاتا ہے یا کپڑوں سمیت غسل دے دیا جائے۔ جب اختلاف ہوا تو اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ پر نیند طاری کر دی۔ حتیٰ کہ اُن کی ٹھوڑیاں سینوں پر آگئیں۔ اسی حالت میں گھر کی ایک جانب سے کسی کہنے والے نے، جسے کوئی نہیں جانتا تھا، کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کپڑوں سمیت غسل دو۔" پس صحابہؓ نے کپڑوں سمیت غسل دینا شروع کیا۔ آپ کی قمیص پر پانی گراتے پھر اسی قمیص سے بدن کو ملتے تھے۔ (بیہقی فی دلائل النبوۃ)

اب دیکھئے کہ اس روایت میں کرامت یا معجزہ "ہاتفِ غیبی کی ندا" ہے۔ یہ روایت اسنادی حیثیت سے جیسی بھی ہے یہ خیال رہنا چاہیئے کہ بیہقی نے اسے نبوت کے دلائل میں بیان کیا ہے نہ کہ بطورِ کراماتِ صحابہ۔

(۸) حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر تیار کیا جس پر ایک ساریہ نامی شخص کو سپہ سالار بنایا۔ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ کے دوران کہا یَا سَارِیَ الْجَبَل (اے ساریہ! پہاڑ کی طرف ہو جاؤ) پس ایک ایلچی لشکر سے آیا اور کہنے لگا۔ "اے امیر المؤمنین! ہماری دشمن سے مڈھ بھیڑ ہو گئی تو اس نے ہمیں شکست دی۔ اس وقت ہم نے ایک پکارنے والے کی پکار سنی کہ یا ساری الجبل تو ہم نے اپنی پشتیں پہاڑ کے ساتھ لگا لیں پس اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی۔ (بیہقی فی دلائل النبوۃ)

اس روایت کو امام بیہقی نے (پانچویں صدی ہجری) میں واقدی کذاب کی تاریخ مغازی سے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں درج کیا۔ یہ روایت دو سندوں سے مذکور ہے۔ پہلی سند میں ابن عجلان راوی مجروح اور منکر الحدیث ہے۔ اور دوسری میں فرات بن السائب منکر الحدیث ہے۔ (التاریخ الکبیر للبخاری، ج ۴، ص ۳)

(۹) ابو الجوزاء کہتے ہیں کہ "ایک دفعہ مدینہ میں شدید قحط پڑ گیا۔ لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس شکایت کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو دیکھو۔ اس کی چھت میں ایک روشندان بنا دو کہ قبر اور آسمان کے درمیان کوئی چھت نہ رہے۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا تو بارش ہوئی اور گھاس اُگی اور اُونٹ اس قدر موٹے ہوئے کہ چربی سے پھٹے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے اس سال کا نام عام الفتق پڑ گیا۔" (دارمی)

یہ روایت منقطع بھی ہے اور ضعیف بھی۔ امام بخاری کہتے ہیں فی اسنادہ نظرٌ (التاریخ الکبیر للبخاری، ص ۱۷، ۱۸، ج ۲) (میزان الاعتدال، ج ۱، ص ۱۲۹، تہذیب التہذیب، ج ۱، ص ۲۸۴)

۱۰۔ ابن المنکدر سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ کا ایک سفینہ نامی غلام زمینِ شام میں لشکر کا راستہ بھول گیا۔ یا کافروں کے ہاتھوں اسیر ہوا۔ پھر وہاں سے بھاگ نکلا اور لشکر کی تلاش میں تھا کہ ایک شیر یکدم ظاہر ہوا۔ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ نے کہا "اے ابوالحارث! (شیر کی کنیت) میں رسول اللہ ﷺ کا آزاد کردہ غلام ہوں اور میرے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے۔ شیر دُم ہلاتا ہوا آگے آیا اور حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ پھر جب کوئی خوفناک آواز سُنتا تو شیر اُس کی طرف قصد کرتا۔ پھر پہلو میں آکر آگے آگے چلنے لگتا۔ یہاں تک کہ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ لشکر میں پہنچ گئے پھر شیر واپس ہو گیا۔" (رواہ البغوی فی شرح السنۃ)

۱۱۔ سعید بن عبدالعزیز سے روایت ہے کہ "جب حرہ کا واقعہ (۶۳ھ) پیش آیا تو مسجدِ نبوی میں تین دن نہ اذان دی گئی نہ جماعت ہوئی۔ اس دوران حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ مسجدِ نبوی میں ہی ٹھہرے رہے۔ آپ کو نماز کا وقت صرف اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ قبرِ نبوی سے ایک خفیف سی آواز سنتے تھے۔"[1] (دارمی)

۱۲۔ نبیہہ بن وہب کہتے ہیں کہ حضرت کعبؒ (احبار تابعی) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو رسول اللہ ﷺ کا ذکر چھڑ گیا۔ کعبؒ کہنے لگے کہ کوئی دن ایسا نہیں چڑھتا کہ اس میں ستر ہزار فرشتے اُترتے ہیں اور قبرِ نبوی کو گھیر لیتے ہیں۔ اپنے پَر مارتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے تو وہ آسمانوں کی طرف چڑھ جاتے ہیں۔ پھر اتنے ہی فرشتے اُترتے اور ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ زمین پھٹے گی (یعنی قیامت کو) تو آپ اسی حال میں قبر سے باہر نکلیں گے کہ ستر ہزار فرشتے آپ کو گھیرے ہوئے ہوں گے۔[2] (دارمی)

مندرجہ بالا تفصیل ہم نے اس لئے پیش کی ہے کہ صحابہ کی کرامات کی تعداد اور صحیح پوزیشن واضح ہو جائے جو خوارق عادت باتیں اسنادی حیثیت سے قوی ہیں ان کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذات سے ہے یعنی وہ معجزات ہیں اور جن باتوں کا تعلق صحابہ یا تابعین (مثلاً کعب احبار) سے ہے۔

---

[1] نمازوں کے اوقات کا تعین سورج سے اور رات اور فجر کی نماز کے اوقات کا تعین چاند ستاروں سے بھی ہو سکتا ہے۔ تو پھر اس خفیف سی آواز سے نمازوں کے اوقات معلوم کرنا عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ [2] اگر یہ روایت صحیح بھی تسلیم کر لی جائے تو اس میں کسی صحابی کی کرامت کی کیا بات ہے؟

ان کی اسنادی حیثیت کمزور ہے اور ان سے احتجاج مشکل ہے۔

صحابہؓ اور تابعینؒ سے کرامات کا صدور کیوں نہ ہوا؟

اگرچہ بعض حقیقت پسند صوفیہ نے اس بات کا برملا اعتراف کر لیا ہے کہ کشف و کرامات ولایت کے لئے ضروری نہیں۔ مگر اولیاء اللہ کے تذکرے پکار پکار کر یہی کہتے ہیں کہ ولایت اور کشف و کرامات لازم و ملزوم ہیں۔ اور کشف و کرامات کی کمی بیشی ہی کسی ولی کی ولایت کا صحیح پیمانہ ہے۔ مولانا اللہ یار خان اپنی کتاب دلائل السلوک کے صفحہ ۱۷ پر فرماتے ہیں کہ تصوف کے لئے کشف و کرامات شرط نہیں۔ اور صفحہ ۲۰ پر اس میں کچھ لچک پیدا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خرقِ عادت امور نہ شرطِ ولایت ہیں نہ جزوِ ولایت ہاں دلائل و علامات ولایت کی حیثیت سے بطورِ سند عطا کئے جاتے ہیں۔ اور صفحہ ۱۹۸ پر فرماتے ہیں کہ کشف و الہام کا ہونا تصوف کے لوازمات سے ہے۔ اس لئے کہ دین کو تسلیم کرنے کے ساتھ اس کے اہم جزو تصوف و احسان کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اسے تسلیم کیا تو کشف و الہام کو ماننا پڑے گا کیونکہ یہ لازم و ملزوم ہیں۔ گویا سچی بات آپ کے منہ سے نکل ہی گئی۔ اب اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرون ثلٰثہ کے مسلمانوں سے کشف و کرامات کا صدور کیوں نہ ہوا، تو اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کا تعلق عوام کے قوت و ضعفِ ایمانی کے ساتھ ہے۔ ایمان قوی ہو تو کشف و کرامات کے صدور کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایمان میں ضعف آگیا تو ایسے امور کی زیادہ ضرورت پیش آئی۔ دورِ صحابہ میں ان حضرات کے ایمان نہایت قوی تھے۔ لہٰذا انہیں ایسی چیزوں کی ضرورت نہ تھی۔ بعد میں ایمان کمزور ہو گئے تو ان اسناد کا مطالبہ ہونے لگا..... دورِ صحابہ میں جب خود وحی موجود تھی۔ حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ آفتاب عالم تاب کی طرح برابر ضیا پاشی کر رہی تھی تو نائب وحی (کشف و الہام) کی کیا ضرورت تھی اور سورج کے مقابلے میں ان چاند ستاروں اور قندیلوں کی کیا ضرورت تھی۔ قاعدہ ہے کہ آفتاب کے غروب ہونے کے بعد فوری طور پر تاریکی نہیں چھا جاتی، بلکہ آہستہ آہستہ روشنی کم ہوتی، تاریکی بڑھتی اور پھیلتی جاتی ہے۔ یہی صورت صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے معاملہ میں پیش آئی۔ صوفیاء کرام نے بعد کی تاریکیوں میں روشنی پھیلانے کا اہتمام جاری رکھا۔ ان کے فیض سے کہیں کوئی چراغ روشن ہوا، کہیں شمع، کہیں کوئی ستارہ ابھرا، کہیں کوئی چاند نکلا۔ بہر حال ان کے دم قدم سے روشنی خواہ

کسی درجے کی سہی موجود رہی۔ بہر حال ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ کشف و الہام کی کمی بیشی قوت و ضعف ایمانی کے تناسب سے ہوتی ہے۔ دورِ صحابہ کے بعد ہی کشف و کرامات کا اظہار اصولاً ہونا چاہیئے تھا اور ایسا ہی ہوا۔" (دلائل السلوک، ص ۲۰۰، ۲۰۱)

مولانا موصوف کے اقتباس بالا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دورِ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں نہ کشف و کرامات کی ضرورت تھی، نہ ان چیزوں کا صدور رہا۔ اور چونکہ کشف و الہام اور تصوّف لازم و ملزوم ہیں۔ لہٰذا تصوّف کی از خود نفی ہو گئی۔ بالفاظِ دیگر تصوّف ایک بدعت ہے۔ پھر جب یہی بات ہم کہتے ہیں تو مولانا اس کا انکار کر کے دوسری تاویلوں میں مصروف ہو جاتے ہیں جن کا ہم جائزہ لے چکے ہیں۔

پھر آپ کے اس جواب میں بھی کئی باتیں محلِ نظر ہیں، مثلاً:

۱۔ آپ یہ فرماتے ہیں کہ کشف و کرامات کا تعلق ضعفِ ایمان کے ساتھ ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو کیا وجہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے آخری ایام میں بھی آپ سے بے شمار معجزات کا صدور رہا۔ مثلاً غزوہ تبوک ۹ھ میں دورانِ جنگ قلتِ رسد کا مسئلہ معجزہ کی برکت سے حل ہوا۔ اس وقت مسلمانوں میں ایمان کی کمزوری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور عرب کا تقریباً سارا علاقہ بھی مسلمان ہو چکا تھا۔ لہٰذا کفار کے لیے سند کی ضرورت نہ تھی۔ پھر اس زمانہ میں اور بھی بہت سے معجزات آپ سے صادر ہوئے۔ جن کا بیان کرنا یہاں صرف طوالت کا باعث ہو گا۔

۲۔ نبوت کا سورج تو صرف ۲۳ سال چمکا۔ پھر اس کے بعد ۲۰۰ سال تک تاریکیاں ہی بڑھتی رہیں اور اس دو سو سال کے عرصہ میں کسی قندیل، شمع یا چاند ستارے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ حالانکہ واقعاتی اور مادی دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ سورج تقریباً ۱۲ گھنٹے چمکتا ہے تو اس کے غروب ہونے کے صرف ایک گھنٹہ بعد اتنی تاریکی چھا جاتی ہے کہ شمعوں اور قندیلوں کے بغیر گزارہ مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ بیان کردہ وجہ بھی معقول معلوم نہیں ہوتی۔

۳۔ جو لوگ حضورِ اکرم ﷺ کے فیض اور تربیت یافتہ اور ایسی شمعوں اور قندیلوں کے اہل تر تھے۔ انہوں نے تو ایسی شمعیں فروزاں نہ کیں اور جو لوگ ان سے درجہ میں کم تر تھے انہوں نے ایسے چاند ستارے روشن کر دیئے جو آفتاب عالم تاب کو بھی ماند کرنے لگ گئے۔

بات دراصل وہی ہے جو ہم بوضاحت پیش کر آئے ہیں کہ کشف و کرامات کا معاملہ جب ایک کسب

اور فن کی شکل اختیار کر گیا اور اس کے حصول کے ذرائع شریعتِ اسلامیہ کے بجائے خارجی دنیا سے مہیا ہونے لگے تو جن لوگوں نے اس کسب و فن پر خصوصی توجہ مبذول فرمائی۔ وہ اس تصوف کی دنیا میں چندے آفتاب و چندے ماہتاب بن کر سامنے آئے اور یہ دور تیسری صدی ہجری سے شروع ہو کر ساتویں صدی ہجری میں اپنے عروج تک پہنچتا ہے۔

کرامات اور استدراج

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر بزرگوں کو ان کرامتوں پر قدرت بھی حاصل ہوتی ہے وہ ہر ملاقاتی کے دلی حالات سے واقف ہوتے ہیں اور اس کو اس خیالات سے مطلع بھی کر دیتے ہیں۔ پھر کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی شکلیں تبدیل کرنے پر قادر ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ ادھر ہاتھ بڑھایا، تو انگور کا خوشہ ہاتھ میں آگیا۔ کچھ ایسے ہیں جو اپنی جوتی آسمان پر بھیجتے ہیں جو کسی ہندو کی جوتی کو مار مار کر نیچے لے آتی ہے۔ وہ بلند بانگ دعوے بھی کرتے ہیں۔ پھر ان کو پورا کر کے بھی دکھا دیتے ہیں۔ یہ تو واضح ہے کہ ایسے واقعات پر مفہوم کے اعتبار سے "کرامت" کا لفظ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اب کرامت کے بعد استدراج ہی باقی رہ جاتا ہے۔ جس کے لئے شیطانی قوتیں مصروفِ عمل رہتی ہیں اور جس کا ذکر ہم پہلے باب میں شاہ ولی اللہؒ کے اقتباس پیش کر چکے ہیں۔

کرامت کا معیار اور اہمیت

لہٰذا ہمیں سنجیدگی سے کرامت اور استدراج کے درمیان فرق کو سمجھ لینا چاہئے۔ جو درج ذیل ہے:

۱۔ کرامت کا صدور کبھی کبھار یا شاذ ہی ہوتا ہے اور اس کا صاحبِ کرامت کو نہ پہلے سے علم ہوتا ہے نہ وہ اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کیونکہ اگر وہ کوئی چیز دعوے سے پیش کر سکتا ہے، تو یہ قدرت ہے کرامت نہیں۔

۲۔ معجزات کی طرح کرامت بھی وہبی چیز ہے۔ کسبی چیز استدراج ہے جسے دعویٰ سے بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں سب سے پہلے صاحبِ کرامت کی زندگی پر غور سے نگاہ ڈالنی چاہئے کہ کوئی چیز سنت کے خلاف تو نہیں؟ سنت کے خلاف یہ باتیں ہیں۔ مجاہدات و ریاضت کی خاطر جنگلوں میں مدتوں قیام کرنا۔ مزارات پر چلہ کشیاں، کشفِ قبور کے طریقے سیکھنا۔ نکاح سے خود پرہیز اور دوسروں کو متنفر کرنا۔ معکوس لٹک کر عبادت کرنا، حبسِ دم، ذکر و اذکار کے بدعیہ اور شرکیہ طریقے۔ متواتر اور وصلی روزوں کے ذریعہ بدن کو نحیف و کمزور بنانا اور نفس کشی کرنا۔ ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر عبادت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب طریقے غیر شرعی ہیں اور یہی کسبی اور اکتسابی ہیں جن کے

ذریعہ کشف و کرامات کے فن کو حاصل کیا جاتا ہے۔ ان طریقوں سے حاصل شدہ کمال استدراج ہوگا کرامت نہ ہوگی

۳۔ کرامت کسی اہم دینی یا دنیوی غرض کو پورا کرنے کے لئے عطا کی جاتی ہے اور یہ بالعموم اتفاقاً سرزد ہوتی ہے۔ جبکہ استدراج دعوے سے پیش کیا جاتا ہے اور بسا اوقات اس سے مقصود اظہار نمود و نمائش اور اپنی ولایت کی دھاک بٹھلانا ہوتا ہے اور اس سے اگر کوئی غرض پوری ہوتی بھی ہے تو وہ حقیر، ادنیٰ اور انفرادی قسم کی ہوتی ہے۔

کرامات سے متعلق جنید بغدادی کا فتوے

حضرت جنید بغدادی ؒ جو صوفیاً میں سید الطائفہ کے لقب سے مشہور ہیں ـــــ کا فرمان ہے کہ " اگر کسی شخص کو ہوا میں چار زانو بیٹھا ہوا دیکھو، پھر بھی اس کی پیروی اس وقت تک نہ کرو۔ جب تک کہ اللہ تعالیٰ کے امر و نہی میں اس کا عمل درست نہ پالو۔" (مقربانِ حق، ص ۴۵)

انہی حضرت جنید کا ایک واقعہ بھی سن لیجئے:

"ایک شخص کچھ عرصہ تک آپ کی خدمت میں رہا۔ پھر رخصت کی اجازت چاہی۔ آپ نے پوچھا "کیوں جاتا ہے؟" اس نے کہا: "میں نے سنا تھا کہ آپ بہت بڑے صاحب کرامت بزرگ ہیں۔ میں اتنی مدت آپ کی خدمت میں رہا مگر کوئی کرامت نہ دیکھی، اس لئے رخصت چاہتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "اس تمام عرصہ میں تو نے میرا کوئی کام خلافِ شریعت بھی دیکھا؟" اس نے کہا: "یہ تو میں نے نہیں دیکھا" آپ نے فرمایا: "بس یہی میری کرامت ہے۔ اب جانا چاہے تو چلا جا۔"

اس واقعہ سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ مریدوں کو اتباعِ رسول کی پرواہ نہیں ہوتی، کرامات کی جستجو ہوتی ہے اور یہی اُن کے نزدیک بزرگی کا معیار ہے۔

۲۔ ولایت کا اصل معیار اتباعِ رسول ہے، کرامات نہیں۔

لیکن اکثر پیر اپنی بزرگی کو جتلانے کے لئے یا مریدوں کو مطمئن کرنے یا اپنی دکان چمکانے کے لئے شیطانی راستوں پر پڑ کر کرامات کے حصول ہی کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں اور مرید بھی یہی کچھ سیکھنے کے لئے "آستانہ عالیہ" پر تشریف لاتے ہیں اور جب ایسے شیطان کے جال میں پھنس گئے تو سمجھتے ہیں کہ ہم کامل ہو گئے۔ چنانچہ انہی حضرت جنید بغدادی سے متعلق درج ذیل واقعہ بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

"نقل ہے کہ آپ کے ایک مُرید پر یہ دیوانگی چھائی کہ وہ کامل ہو گیا ہے۔ اسے ہر رات دکھائی دیتا کہ فرشتے اسے سواری پر بٹھا کر جنّت کی سیر کراتے اور طرح طرح کے میوے کھلاتے ہیں۔ آپ اس کے پاس گئے، دیکھا بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھا ہے۔ آپ نے کیفیت پوچھی تو اس نے بڑے فخر سے اپنے بلند مقام اور بہشت کی سیر کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: "آج جب بہشت میں جاؤ، تو میوے کھانے سے پہلے لاحول ولاقوۃ پڑھنا۔" چنانچہ حسبِ معمول جب وہ بہشت میں پہنچا، تو حضرت کا فرمان یاد آ گیا اس نے جب لاحول پڑھا تو ایک چیخ سنی اور بہشت کو آنِ واحد میں غائب دیکھا اور اپنے آپ کو خود ایک گندی جگہ پر بیٹھے ہوئے پایا۔ کر بٹ اور مُردوں کی ہڈیاں آگے پڑی ہوئی تھیں۔ سمجھا کہ یہ شیطانی جال تھا اور وہ شیطانی استدراج میں مبتلا تھا۔ پس حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہوا۔" (مقربانِ حق ۲۲۷)

تصریحات بالا سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ اولیاء اللہ کی صحیح پہچان یہ ہے کہ وہ متبع سنت ہوں خواہ ان سے کبھی کسی کرامت کا ظہور ہو یا نہ ہو۔

۲۔ جس بزرگ سے بکثرت کرامات کا ظہور ہونے لگے وہ سمجھ لے کہ شیطان کے جال میں پھنس گیا۔ اسے اپنے متعلق جلد از جلد غور کرنا چاہیئے اور توبہ و استغفار کرنا چاہیئے۔

التعرف میں کرامت پر تبصرہ

چنانچہ التعرف جو صوفیاء کی مستند کتاب اور اوّلین ماٰخذ میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے مصنف کلابازی (م ۳۸۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

"جب ولی سے کوئی کرامت ظاہر ہو تو اس کا عجز و انکسار بڑھ جاتا ہے ..... ولی سے جو کرامات ظاہر ہوتی ہیں، انہیں ان کا علم ہی نہیں ہوتا .... ولی کی کرامت ان اُمور میں ہوتی ہے دُعا کی مقبولیت، حال کی تکمیل، عمل کرنے کے لئے مزید قوت اور روزی سے بے فکری جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ لے لیتے ہیں اور انبیاء کے معجزات کسی معدوم چیز کو عدم سے لانا اور ایک چیز کی ہیئت بدل ڈالنا ہوتا ہے ...... ولی کو اپنی ولایت کا علم ہونا جائز نہیں اس لئے کہ اِس سے ولی سے خوف جاتا رہتا ہے۔" (اقتباس از ص ۱۰۸، ۱۰۹ ترجمہ التعرف مطبوعہ المعارف، مترجم پیر محمد حسن)

مولانا اشرف علی تھانوی کا تبصرہ

"بعض بزرگوں کا قول ہے الکرامات حیض الرجال، یعنی جس طرح عورت حیض سے شرماتی ہے اسی

طرح اہل اللہ اپنی کرامتوں سے شرماتے ہیں۔ بہت سے اہلِ کرامت بزرگوں نے تمنا کی۔ کاش ہم سے کرامت کا صدور نہ ہوتا۔ وجہ یہ کہ انہوں نے بقدر اپنی کرامت کے آخرت کے درجات میں کمی محسوس کی۔" (تجدید تصوف سلوک، ص ۹۱)

اب خدارا کہیے کہ اولیاء اللہ یا ان کی جو کرامات تذکروں میں مندرج ہیں یا جو ہم نے درج کتاب کی ہیں وہ اس معیار پر پوری اترتی ہیں؟ پھر یہ کرامات ہیں بھی ایسی کہ ان کے سامنے انبیاء کے معجزات بھی ہیچ نظر آنے لگتے ہیں۔ ہم ذیل میں ایسی ہی چند کرامات کا ذکر کریں گے۔

اولیاء اللہ کی کرامات

۱۔ مُردہ کو زندہ کرنا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مُردوں کو زندہ کرنا ایک عظیم الشان معجزہ ہے اور اسی بنا پر اُن کو خدا سمجھا گیا تھا۔ اب ہمارے اولیاء کا کم از کم معیار یہ ہے کہ مُردوں کو تو زندہ کر کے دکھا سکیں۔ مثلاً خواجہ فریدالدین گنج شکر کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

چشتیہ کا معیارِ ولایت ہی مُردوں کو زندہ کرنا ہے

"پھر آپ نے فرمایا کہ اے درویش! خواجہ قطب الدین بختیار کاکی چشتی قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا کہ حضرت یہ کیونکر معلوم ہو کہ اب سلوک کا مرتبہ تمام ہو گیا اور یہ شیخ کمال کو پہنچ گیا۔ فرمایا: "اگر وہ کسی مُردہ پر دم کر دے تو وہ مُردہ خدا کے حکم سے زندہ ہو جائے تو اس وقت سمجھ لو کہ وہ کمالیت کو پہنچ گیا۔" پھر آپ نے فرمایا: "کہ خواجہ قطب الدین چشتی قدس سرہ العزیز اسی محل پر یہ فوائد فرما ہی رہے تھے کہ ایک عورت روتی ہوئی آئی اور قدموں میں سر رکھ دیا اور کہا کہ ایک بچہ رکھتی تھی کہ اسے بادشاہ نے بے گناہ دار پر کھنچوا دیا۔ خواجہ اس کی عرض داشت سن کر کھڑے ہو گئے۔ اور عصا ہاتھ میں لے کر اس کے ساتھ ہو لئے۔ آپ کے اصحاب بھی آپ کے ساتھ ہو لئے اور اس دار کشیدہ لڑکے کے پاس پہنچے۔ ہندو مسلمان کی ایک بھیڑ لگ گئی۔ خواجہ نے کہا: "الٰہی! اگر اسے بے گناہ بادشاہ نے دار پر کھینچا تو اسے زندہ کر دے۔ آپ کہہ ہی رہے تھے کہ وہ لڑکا زندہ ہو گیا اور ساتھ

چلنے لگا۔ یہ کرامت دیکھ کر کئی ہزار ہندو مسلمان ہو گئے۔ پھر آپ اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ: "مرد کی کمالیت اس سے زیادہ نہیں ہے۔" (اسرار الاولیاء ملفوظات خواجہ فرید گنج شکر، ص ۱۱۱

مرتبہ خواجہ بدر اسحٰق، ترجمہ غلام احمد بریاں، مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۱۶ء)

مندرجہ بالا اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں:

۱۔ انبیاء سب ہی کامل ہوتے ہیں لیکن ان میں سے صرف حضرت عیسٰی علیہ السلام کو باذن اللہ مردہ زندہ کرنے کا معجزہ عطا ہوا لیکن خواجگان چشت کے کئی باکمال کم از کم اتنا "تصرف" ضرور رکھتے ہیں۔ اور وہ یہ معجزہ دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

۲۔ یہ بزرگ دوسروں سے سجدہ کرانا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ اگر یہ انہیں ناپسند ہوتا تو ضرور اس عورت کو روک دیتے۔

۳۔ کاش کہ انبیاء کو اللہ تعالےٰ یہی طریقہ تبلیغ و اشاعت دین سمجھا دیتے اور عطا کر دیتے کہ لوگ ایک ہی کرامت دیکھ کر ہزارہا کی تعداد میں مسلمان ہو جاتے۔ اور انہیں "متٰی نصر اللہ" بھی نہ پکارنا پڑتا۔ پھر جو لوگ اس طرح کی کرامتیں دیکھ کر مسلمان ہوئے، وہ ان پیروں کے خادم تو ضرور بن جائیں گے، لیکن اسلام وہ بے چارے کیا سمجھ سکیں گے؟

لَا اِلٰہ سے مارنا اور اِلَّا اللہ سے زندہ کرنا

اب دیکھئے صاحب حدیقۃ الاولیاء صفحہ ۷۹ پر شاہ ابو المعالی چشتی صابری کے بیان میں لکھتے ہیں کہ:

"عند التذکرہ حضرت شاہ نے فرمایا کہ مرگ و حیات کلمہ نفی اثبات لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ میں ہے۔ جنہوں نے دل سے یہ کلمہ پڑھا ہے اگر وہ لفظ لا الٰہ زندہ کے کان میں کہہ دیں تو مر جائے اور اگر اِلَّا اللہ کہہ دیں تو جی اٹھے۔ حاضرین مجلس نے التماس امتحان کی۔ حضرت مجلس سے اُٹھے اور ایک گاؤمیش کے کان میں جو اسی گھر میں بندھی تھی لَا اِلٰہ کا لفظ کہا۔ وہ فی الفور گر پڑی اور مر گئی پھر دوسرے کان میں اِلَّا اللہ کا لفظ کہا فی الفور گاؤمیش جی اٹھی اور چارہ چرنے لگی۔"

اسے کہتے ہیں ہتھیلی پر سرسوں جما دینا۔ کیا جادو کی اس سے بڑھ کر تاثیر ہو سکتی ہے۔ افسوس کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں، صحابہ اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کی اس تاثیر کا علم نہ ہو سکا، ورنہ

حضورِ اکرم ﷺ کم از کم اپنے چچا ابو طالب اور زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو ہی زندہ کر لیتے، جن کی غمی کی وجہ سے اس سال کا نام ہی "عام الحزن" قرار پایا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ اسی مندرجہ کتاب کے صفحہ ۱۵۱ پر مذکور ہے جو سید جلال الدین شیر شاہ سے تعلق رکھتا ہے، فرماتے ہیں:

"ناگاہ آپ کا گزر ایک مجمع پر ہوا، پوچھا کیسا مجمع ہے؟ لوگوں نے کہا اس مُردہ کی نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں۔ کہا کہ: "نماز پڑھ کر پھر کیا کرو گے؟" کہا "اس کو زمین میں دفن کر دیں گے۔ یہ بات سُن کر حضرت جلال رح جلال میں آ گئے اور نعرہ اللہ اکبر مار کے مُردہ کے مُنہ سے پردہ اٹھایا اور فرمایا: "قُمْ باذنِ اللہ! مُردہ فی الفور جی اٹھا اور چالیس برس تک زندہ رہا۔"

پیرانِ پیر کی مسیحائی

"پیرانِ پیر تو اس کام میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ایک چیل آپ کے وعظ کے دوران اوپر منڈلانے لگی اور چلّانے لگی تو آپ نے ہوا کو حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر دے۔ بیچاری چیل کا سر تن سے جدا ہوا اور اس کا سر اور دھڑ آپ کے سامنے زمین پر آ پڑے۔ پھر آپ نے لوگوں کے سامنے اس کا دھڑ اور سر جوڑ کر اسے اڑا بھی دیا۔" (سیرتِ غوث ص ۱۹۲۔ پانچ کتب تذکرہ کے حوالہ سے۔ گویا یہ روایت نہایت ثقہ ہے)

پھر ایک دفعہ یوں ہوا کہ آپ نے مرغی کا سالن کھا کر ہڈیاں ایک طرف رکھ دیں۔ پھر ان ہڈیوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا قُومی باذنِ اللہ۔ تو وہ مُرغی زندہ ہو گئی تھی۔ (سیرتِ غوث، ص ۱۹۱۔ آٹھ کتب تذکرہ کے حوالہ سے۔ گویا یہ روایت پہلی سے بھی ثقہ ہے)

اور آپ کا اصل شاہکار یہ ہے کہ ایک دن ایک عیسائی اور مسلمان جھگڑ رہے تھے۔ عیسائی کہتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام افضل ہیں اور مسلمان کہتا تھا کہ ہمارے رسول ﷺ افضل ہیں۔ آپ کا ادھر سے گزر ہوا تو عیسائی سے آپ نے پوچھا کہ حضرت کیسے افضل ہیں؟ وہ کہنے لگا کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام قم باذن اللہ کہہ کر مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا "میں رسول کریم ﷺ کا تابع اور غلام ہوں۔ اگر میں زندہ کر دوں تو ایمان لے آؤ گے؟" عیسائی کہنے لگا "ہاں!" آپ نے عیسائی کو کہا کہ کوئی بہت پرانی قبر دکھاؤ۔ اس نے قبر دکھائی تو آپ نے فرمایا: "دیکھو! یہ ایک گویے کی قبر ہے اگر تم چاہو تو میں یہ بھی کر سکتا ہوں کہ وہ گاتا ہوا اٹھے۔" عیسائی نے کہا میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" اب حضرت

عیسیٰ علیہ السلام تو قم باذن اللہ کہہ کر مُردہ زندہ کرتے تھے، مگر پیرانِ پیر نے 'قم باذنی' کہا، جس کے ساتھ ہی قبر پھٹی اور مُردہ گاتا ہوا نکل آیا۔ یہ کرامت دیکھ کر وہ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔" (تفریح الخاطر، ص ۱۶، ۱۵)

عیسٰے کے معجزوں نے مُردے جِلا دیئے　　محمد کے معجزوں نے مسیحا بنا دیئے

(سیرت غوث، ص ۱۹۲)

اب دیکھئے کہ :

۱۔ عیسائی کے جھگڑے کی دلیل ہی یہ تھی کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام تو مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے لیکن تمہارے نبی ایسا نہیں کرتے تھے اور یہ ہے بھی درست۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کونسے معجزوں نے مُردوں کو زندہ کرنے والے مسیحا کیسے بنا دیئے۔ جو کام استاد نہیں کر سکتا وہ شاگرد کیسے کر سکتا ہے؟ کیا یہ شاگرد اپنے استاد سے یا غلام آقا سے بڑھ گئے ہیں۔؛

۲۔ پیرانِ پیر کی کرامت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے بڑھ چڑھیا ہے اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں :

ا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قم باذن اللہ کہہ کر مُردہ زندہ کرتے تھے لیکن آپ قم باذنی کہہ کر مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔

ب۔ حضرت عیسٰے علیہ السلام کسی کہنہ قبر کا مُردہ زندہ نہیں کرتے تھے۔

ج۔ اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں یہ کمال تھا کہ اگر مُردہ گویا ہے تو وہ گاتا ہی اٹھے۔

شیخ علی بن ہیتی اور مقتول کا کلام

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ مذکور ہے، کہ کوئی شخص قتل ہو گیا، لیکن قاتل کا سراغ نہیں ملتا تھا سب ایک دوسرے پر الزام تھوپتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسٰے علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں سے کہیں کہ ایک گائے ذبح کریں۔ پھر اس مذبوحہ گائے کا ایک ٹکڑا اس مقتول کے جسم پر ماریں، تو وہ لاشہ قاتل کا نام بتلا دے گا۔ (سورہ بقرہ) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اب ہمارے اولیاء اللہ کی کرامات ایسے معجزات سے بلند ہیں۔ کیونکہ وہ مقتول اور اس کی کلام کے درمیان کسی قسم کا واسطہ لائے بغیر ان سے جواب حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ علی بن ہیتی کے متعلق مذکور ہے کہ :

"ایک روز آپ قصبہ ہز ملک میں گئے۔ دیکھا کہ وہاں کے لوگ ایک مقتول کے سرہانے کھڑے

جھگڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام رکھ رہے ہیں۔ آپ نے یہ نزاع دیکھی تو مُردے سے مخاطب ہو کر کہا "بندۂ خدا! خود کیوں نہیں بتا دیتا کہ تیرا قاتل کون ہے؟" مُردے نے فی الفور آنکھیں کھولیں اور کہا کہ: "میرا قاتل فلاں بن فلاں ہے۔" اور پھر آنکھیں بند کر کے مر گیا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۵۴)

صرف نظر پڑنے سے مُردہ کا زندہ ہو جانا

ان بزرگوں کے بعد تو ایسے ایسے عظیم الشان اولیاء اللہ پیدا ہونے لگے کہ ان کی صرف نظر پڑنے سے ہی مردے زندہ ہو جایا کرتے تھے مثلاً:

۱۔ خواجہ محمد فضیل قادری نوشاہی (م ۱۱۱۱ھ) کا ذکر ہو رہا ہے:

"جس فاسق و فاجر پر حالتِ جذب و سکر میں نظر پڑ جاتی۔ عارف کامل ہو جاتا۔ کسی مُردہ پر نظر پڑتی تو زندہ ہو جاتا۔ نگاہِ غضب سے کسی کی طرف دیکھتے تو اس کی جان تن سے نکل جاتی۔ غرض آپ کے احوال و مقامات عجیب و غریب تھے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۷۷)

اب دیکھئے صاحب خزینۃ الاصفیاء فرما رہے ہیں کہ "جس فاسق و فاجر پر حالت جذب و سکر میں نظر پڑ جاتی وہ عارفِ کامل ہو جاتا۔" اس سے آپ اندازہ لگا ہی سکتے ہیں کہ خود خواجہ محمد فضیل کس پایہ کے عارف کامل ہوں گے۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان نوشاہی اولیاء اللہ کے کردار کا تعارف ہم کسی دوسرے مقام پر کرا چکے ہیں۔

پیر شمس سبزواری (تبریزی م ۶۷۵ھ) کا مردہ کو زندہ کرنا پھر سورج کو زمین کے قریب لانا

اب فرقہ شیعہ امامیہ اسماعیلیہ کے ایک ولی اللہ پیر شمس سبزواری (تبریزی ثم ملتانی) کی کرامات ملاحظہ فرمائیے:-

جس زمانہ میں پیر شمس ملتان میں تھے۔ اسی زمانہ بادشاہ کا اکلوتا فرزند مر گیا۔ بے حد مغموم ہوا۔ اس نے فقراء، حکماء اور صوفیاء سے کہا۔ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم اللہ کے مقرب ہو۔ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو میرے لڑکے کو زندہ کر دو۔ ورنہ میں سب کو کولہو میں پلوا دوں گا۔" یہ ماجرا سن کر سب گھبرا گئے۔ اور اپنی زندگی کی سلامتی کے لیے ان سب کی نظر انتخاب پیر شمس پر پڑی۔ پیر شمس نے مطالبہ منظور کر لیا۔ اور مردہ فرزند کے پاس جا کر فرمایا فرمایا۔ قُمْ باذن اللہ۔ مگر شاہزادہ نہ اٹھا۔ پھر آپ نے کہا قُم بِاذْنِی۔ تو شاہزادہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا مگر ان فقراء نے پیر شمس کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس پر یہ تہمت رکھی کہ اس نے اپنے حکم سے فرزند کو زندہ کیا۔ لہٰذا اس پر شرعی حکم نافذ ہونا چاہیئے۔ اور ان کی جیتے جی جسم کی کھال اتار لینی چاہیئے۔ پیر شمس نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو اپنے جسم پر ایک کالی کمبلی ڈالی۔ اور اپنے

سر کے بالوں کو ہاتھ میں پکڑ کر تمام جسم کی کھال کھینچ کر علماء کے سامنے پھینک دیا۔ انہوں نے یہ دیکھ کر کانپنا شروع کر دیا۔ اور ان کے کہنے پر لوگوں نے پیر شمس سے تمام کاروبار اور لین دین ترک کر دیا۔"

"عرصہ دراز اسی طرح گزر گیا اور جب بھوک معلوم ہوئی تو لوگوں سے کھانا مانگا مگر کسی نے نہ دیا۔ آخر ایک قصاب کو رحم آیا اور اس نے خفیہ طور پر ایک گوشت کا ٹکڑا دے دیا۔ اب پکانے کی فکر ہوئی۔ اسی حالت پر غور کرتے ہوئے آپ ملتان شہر کے باہر چلے آئے اور سورج کی طرف نظر کر کے فرمانے لگے۔ (اشعار کا ترجمہ) اے آفتاب تیزی مت کر تیزی مت کر۔ ایک پل کے لیے تھم جا۔ میں زمانہ قدیم سے تیرا عاشق ہوں۔ . . . گلزار شمس میں لکھا ہے کہ یہ اشعار پیر شمس کی زبان سے تمام ہوتے ہی آفتاب نیچے اتر آیا اور تمام ملتان شہر گرمی کی شدت سے بے چین ہو گیا۔ کئی اشخاص دوڑتے ہوئے پیر شمس کے پاس آئے اور پاؤں پکڑ کر معافی مانگی۔ ایک لحظہ میں گوشت پک جانے پر سورج اپنی جگہ پر چلا گیا جس جگہ سے سورج اترا تھا وہ جگہ اسٹیشن سے بہت قریب ہے ہر سال وہاں میلا لگتا ہے۔ یہ جگہ سوریہ کنڈ کے نام سے مشہور ہے۔ اس جگہ کیشو پوری نامی ایک مندر ہے جس میں پیر کی کرامت کی تصویر دیوار پر کھینچی ہوئی ہے" (نور مبین ص۴۸۵ تا ۴۸۹ ملخصاً مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند بمبئی)

مندرجہ ذیل طویل اقتباس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:۔

۱۔ حضرت عیسیٰ تو قم باذن اللہ کہہ کر مردے زندہ کیا کرتے تھے مگر پیر شمس والا مردہ قم باذن اللہ سے تو حرکت میں نہ آیا۔ بلکہ قم باذنی پر زندہ ہوا۔ اس سے تین نتیجے نکل سکتے ہیں (۱) اگر یہ کرامت ہے تو حضرت عیسیٰ کے معجزے سے بدرجہا بڑھیا ہے (۲) یہ کھلا ہوا جادو ہے کیونکہ شریعت کے مطابق نہیں جیسا کہ اس وقت کے علماء نے سمجھا (۳) یہ واقعہ ہی کذب و اختراع پر مبنی ہو۔

۲۔ پیر شمس نے علماء کی تعزیر کے مطابق خود ہی اپنے بال پکڑ کر اپنی کھال کھینچ کر علماء کے سامنے پھینک دی تھی۔ البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہاتھوں سے آپ نے سر کے بالوں کو پکڑا ہوا تھا تو ہاتھوں کی کھال اترتے وقت ہاتھ یقیناً چھوٹ گئے ہوں گے۔ پھر آپ اپنی کھال اتارنے میں کیونکر کامیاب ہوئے تھے؟

۳۔ جب سورج پیر شمس کے گوشت کا ٹکڑا بھوننے کے لیے بالکل نزدیک آ گیا۔ تو گوشت کا ٹکڑا تو گل گیا مگر پیر صاحب کا اتنی شدید گرمی سے کچھ بھی نہ بگڑا۔ اور ملتان کے سب لوگ تو اس قدر سورج کی تپش کی وجہ سے بے چین ہو گئے۔ مگر باقی دنیا جس پر سورج کی نزدیکی سے یہ مصیبت نازل ہوئی ان کا غالباً کچھ بھی نہ بگڑا تھا۔ ورنہ یہ واقعہ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہوتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ان کراماتی نگاروں نے لوگوں کو الو سمجھ رکھا ہے۔ اور حقیقت ہے بھی یہی کہ اولیاء اللہ نے عوام کی عقلوں کو اس قدر چاٹ لیا ہے۔ کہ ان کی ہر طرح کی خرافات پر یقین کرنے لگتے ہیں۔

۲۔ اسی طرح کے ایک اور نوشاہی "اولیاء اللہ" ہیں۔ عبدالرحمٰن المعروف بہ پاک رحمان یا رحمٰن دیوانہ بھڑی والا۔ یہ بزرگ خواجہ محمد فضیل سے بازی لے جاتے ہیں۔ کیونکہ خواجہ فضیل کی تو اپنی "نظر" یہ اور وہ کرشمے دکھلاتی تھی۔ لیکن آپ ایسے کرشموں کا تصرف دوسروں کو بھی عطا فرما سکتے تھے۔ چنانچہ صاحب خزینۃ الاصفیاء رقمطراز ہیں کہ :

"ایک روز آپ اپنے خادم شیخ سعدی (صحیح نام شادی ہے جو کیلیانوالہ کا باشندہ تھا۔ تذکرہ نوشاہی) پر بے حد مہربان ہو کر فرمانے لگے : "ہم نے اللہ تعالیٰ سے تمہارے لئے یہ چاہا ہے کہ "جس مریض پر تیری نظر پڑے وہ صحت یاب ہو جائے۔ جس مردہ کی طرف تو متوجہ ہو وہ زندہ ہو جائے اور جس فاسق و فاجر پر تیری نظر پڑے وہ ولی کامل ہو جائے۔" بارگاہِ خداوندی میں آپ کی یہ دعا قبول ہو گئی۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۰۵)

اب بتلایئے کہ انبیاء کے معجزات ہمارے ان "اولیاء اللہ" کی کرامات کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟

۲۔ ہوا پر حکومت

اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کر دیا تھا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کا ہوا پر حضرت سلیمان علیہ السلام سے زیادہ کنٹرول ہے۔

۱۔ حبیب اعجمیؒ کی ہوا پر حکومت

" نقل ہے کہ ایک عورت حضرت حبیب اعجمی کے پاس روتی ہوئی آئی اور کہا کہ میرا لڑکا عرصہ سے گم ہے۔ دعا کریں خدا اسے لا دے۔" آپ نے فرمایا: تیرے پاس کچھ ہے؟ اس نے تھوڑی سی چاندی پیش کی۔ آپ نے لے کر درویشوں میں بانٹ دی اور کہا "جاؤ تیرا لڑکا تیرے گھر کے دروازے پر کھڑا ہے۔" وہ آئی تو لڑکے کو موجود پایا۔ سینہ سے لگا کر پوچھا "بیٹا! تو کہاں تھا؟" اس نے کہا "میں کرمان میں تھا۔ میں نے سنا کوئی کہہ رہا ہے "اے ہوا اس کو اٹھا کر اس کے گھر پہنچا دے، حبیبؒ کی دعا اور صدقہ کی برکت سے" پس میں نے اپنے آپ کو یہاں پایا۔" (مقربانِ حق، ص ۴۲)

اب حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تو فقط اتنا تھا کہ وہ ایک ماہ کا سفر چند گھنٹوں میں طے کر لیتے تھے، لیکن معاملہ یہاں تک نہیں، بلکہ ہمارے صوفیاء کا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص بلقیس کا تخت پلک جھپکنے میں لایا تھا وہ "ولی" تھا اور اس کا تصرف حضرت سلیمان علیہ السلام (جو کہ نبی تھے) سے زیادہ تھا اس کی تحقیق ہم پہلے پیش کر چکے ہیں کہ وہ نہ جن تھا نہ کوئی انسان بلکہ اللہ کے ان فرشتوں سے ایک فرشتہ تھا جو مشیتِ الٰہی کے تحت تدبیرِ کائنات پر مامور ہیں۔ البتہ ہمارے وَلی اس کے مقابلہ میں پورے اُترتے ہیں۔

کرامات کا معجزات سے بڑھیا ہونے کا شرعی ثبوت

اب نبوت سے ولایت کی فضیلت کا اقرار انہی صوفیاء کی زبان سے سنئے۔ اسی واقعہ سے آگے مذکور ہے:

حضرت عطارؒ فرماتے ہیں اگر کوئی اعتراض کرے تو اسے تخت بلقیس مع بلقیس کے ایک طرفۃ العین میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچنے کی حکایت قرآن سے پڑھنی چاہیئے۔ اگر اس پر ایمان ہے تو یہ اس سے سہل تر ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"میری اُمت کے علماء پہلے انبیاء کی مثل ہوں گے (اور کرامات کا ظہور اس سے بھی بڑھ کر ہوتا رہا ہے)" (مقربانِ حق، ص ۴۳)

اب دیکھئے کہ صاحب مقربانِ حق نے:

۱۔ تختِ بلقیس کے ساتھ "مع بلقیس" کا اضافہ اپنی طرف سے کر لیا ہے۔

۲۔ جس حدیث سے (یعنی عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل) آپ استدلال فرما رہے ہیں یہ حدیث آئمہ حدیث کے نزدیک مجروح اور ناقابلِ احتجاج ہے۔ علاوہ ازیں کہ کسی امتی کا (خواہ وہ امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے کیوں نہ ہو) درجہ کسی بھی نبی کے برابر نہیں ہو سکتا۔

۳۔ پھر اس حدیث میں بھی ذکر علماء کا ہے۔ عباد، زہاد، صالحین، صوفیاء، اولیاء اللہ کا ذکر نہیں اور یہ تو ظاہر ہے کہ کشف و کرامات کا تعلق دوسرے گروہ سے ہے نہ کہ علماء سے۔

۴۔ پھر اس مجروح حدیث کے ساتھ بریکٹوں میں ان الفاظ کا اضافہ "کرامات کا ظہور اس سے بڑھ کر ہوتا رہا ہے۔" اپنی طرف سے کر لیا ہے اور اس طرح یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اگر ہمارے اولیاء اللہ کی کرامات

انبیاء کے معجزات سے زیادہ عظیم الشان ہیں، تو اس کی بھی شرعی بنیاد موجود ہے۔ اَلَا سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ۔

۲۔ رابعہ بصریہ کی پانی اور ہوا پر حکومت

"حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت رابعہ کو دجلہ کے کنارے بیٹھے دیکھا میں نے اپنا مصلیٰ دجلہ میں ڈالا اور کہا: "رابعہ! یہاں آکر نفل پڑھو۔" آپ نے فرمایا: "آپ اپنی بزرگی دُنیا پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔" پھر اپنا مصلیٰ ہوا میں بچھا دیا اور کہا: "یہاں آؤ تاکہ دنیا کی نظر سے چھپ جائیں۔"

(مقربانِ حق، ص ۴۷)

اس کرامت پر تبصرہ کرنا کچھ زیب نہیں دیتا، کیونکہ شرعی نقطہ نظر سے اجنبی عورت اور مرد کا اس طرح کا اختلاط حرام ہے، خواہ وہ اولیاء اللہ ہی کیوں نہ ہوں، بلکہ اولیاء اللہ کے لیے اور زیادہ پرہیز ضروری ہے۔ پھر یہ واقعہ تاریخی لحاظ سے بھی غلط ہے، کیونکہ حسن بصری اور رابعہ بصریہ کی ملاقات بھی ثابت نہیں۔ حسن بصری کا سنِ وفات بالاتفاق ۱۱۰ھ ہے اور رابعہ بصری بقول بعضے ۹۵ھ اور بقول بعضے ۹۹ھ میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی میں آپ کو کسی نے پکڑ لیا، پھر آگے فروخت کر دیا۔ آپ کی پاک طبیعت کی وجہ سے مالک نے آپ کو آزاد کر دیا۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱۰، ص ۹۲) اب ان حالات میں اندازہ فرمالیجیے کہ ان کی ملاقات کا کوئی امکان ہے؟

۳۔ ہوائی سفر اور عثمان ہارونی

منقول ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں خواجہ عثمان ہارونی کے ساتھ سفر میں تھا۔ ہم دجلہ کے کنارے پہنچے تو کوئی کشتی موجود نہ تھی۔ خواجہ عثمان نے فرمایا "تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔" میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر جو آنکھیں کھولتا ہوں تو اپنے آپ کو خواجہ کے ہمراہ دریا کے اُس پار پاتا ہوں۔ میں نے خواجہ سے پوچھا: "خواجہ آپ نے کیا کیا؟" فرمایا: "پانچ دفعہ سورہ فاتحہ پڑھی۔"

دیکھئے! اگر آپ پانچ دفعہ سورہ فاتحہ پڑھیں، تو چنداں فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ اگر صحابہ کرام بھی پڑھتے تو اس طرح کبھی دریائے دجلہ عبور نہ کر سکتے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ پہلے کسی شیخ کامل کا فیض حاصل کر کے سورہ فاتحہ کی زکوٰۃ نکالی جائے۔ سورہ فاتحہ کی زکوٰۃ کیا ہے؟ اس کی تفصیل باب زیرِ عنوان "ولایت کی تعلیم" میں ملاحظہ فرمائیے!

عثمان ہارونی صاحب نے اس سورہ فاتحہ کی زکوٰۃ سے کئی بار کرامات دکھلائی تھیں۔ جن کا ذکر اس کتاب میں مناسب مقامات پر آچکا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے اولیاء اللہ ہیں، جو اس کام میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مثلاً:

۴۔ خواجہ ابو اسحٰق چشتی (م ۳۲۹ھ)

"جب سفر کا ارادہ فرماتے، تو دو سو آدمیوں کے ساتھ آنکھ بند کر کے فوراً منزل مقصود پر پہنچ جاتے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۲)

اب بتلایئے کیا حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہوائی تخت بہتر تھا یا آپ کی یہ کرامت۔ جس میں آپ اپنے علاوہ مزید دو سو آدمیوں کو آنکھ جھپکنے میں منزل مقصود تک پہنچا دیتے تھے۔

۵ ایک اور ولی اللہ خواجہ مودود چشتی (م ۵۲۷) کو طی الارض حاصل تھا۔ چنانچہ جب طواف کو جی چاہتا ہوا کے ذریعہ مکہ مکرمہ پہنچ جاتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۹)

۵۔ حسین لاہوری کا کرشمہ

بعد ازیں تو یہ ہوا پر حکومت اور طی الارض کا کسب و فن اتنا عام ہوا کہ حسین لاہوری جیسے ولی بھی اس میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ حسین لاہوری خود داڑھی مونچھ چٹ، کسی کو اس وقت تک مرید ہی نہ بناتا جب تک وہ داڑھی نہ منڈاتا اور شراب نہ پیتا۔ شراب کا رسیا، ہر وقت صراحی و جام ساتھ رہتا۔ ڈھول کی تھاپ پر رقص کرتا اور ہندو لونڈے مادھو لال سے عشق بازی فرمایا کرتا تھا۔ ایک شخص حاجی یعقوب مدینہ منورہ کا رہنے والا شیخ کو ہر روز روضہ نبوی ﷺ میں معتکف دیکھتا۔ ایک دفعہ ہندوستان آیا تو حسین کو لاہور میں شراب میں دھت، ڈھول کی تھاپ پر رقص کرتے دیکھ کر پوچھا: یہ کیا حال ہے؟ حسین لاہوری نے کہا، آنکھیں بند کرو۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہی اپنے کو مدینہ منورہ میں اور حسین لاہوری کو روضہ نبوی ﷺ میں معتکف پایا۔ (خزینۃ الاصفیاء) پھر یہی حسین لاہوری اپنے معشوق کو اسی طرح آنکھیں بند کرا کے گنگا جل میں اشنان کرانے لے گیا اور پھر اسی طرح واپس لاہور بھی لے آیا تھا۔ اسی کرامت سے متاثر ہو کر مادھو لال مسلمان ہو کر حسین لاہوری کی بیعت ہوا، پھر خلیفہ بنا اور اسی عشق بازی کی بناء پر یہ دونوں پیران طریقت لاہور میں ایک ہی جگہ مدفون ہوئے۔ واضح رہے کہ حسین لاہوری نے بھی ۲۶ سال جنگلوں میں ریاضت و مجاہدہ کیا تھا۔ یہ سب شعبدہ بازیاں اسی مجاہدہ کا ثمرہ تھیں، لہٰذا یہ بات خوب ذہن نشین کر لیجئے، جس ولی اللہ نے جتنی زیادہ ریاضت و مجاہدہ جنگلوں میں کیا ہوگا۔ اسی

طرح کی شعبدہ بازیاں ضرور جانتا ہوگا۔ پھر ہمیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تصوّف اور کشف و الہام لازم و ملزوم ہیں اور تصوّف و احسان دین کا اہم جزو ہی نہیں بلکہ جسد میں رُوح کی مانند ہے، البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس "رُوح فی الجسد" کی ضرورت نہ تھی۔

۷۔ ابوالحسن خرقانی قطبِ عالم کی ہوا پر حکومت

ابوالحسن خرقانی کے ایک مُرید نے آپ سے اجازت چاہی کہ میں کوہِ لبنان میں جا کر قطبِ عالم کی زیارت کروں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ جب وہ مُرید وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک جنازہ رکھا ہے اور لوگ قبلہ رُو بیٹھے کسی کی انتظار کر رہے ہیں۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ قطبِ عالم آئیں گے اور اس کی نمازِ جنازہ پڑھائیں گے اور وہ پانچوں وقت یہاں تشریف لا کر ہر نماز کی امامت کراتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ خرقانی تشریف لائے اور امامت کرائی۔ مَیں یہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ امام صاحب کون تھے اور اب دوبارہ کب آئیں گے؟ جواب ملا کہ "یہ ابوالحسن خرقانی تھے اور اب دوسری نماز کے وقت تشریف لائیں گے۔" مجھے اپنے آپ پر سخت افسوس ہوا کہ آپ کا مرید ہونے کے باوجود اتنا بھی نہیں جانتا کہ قطبِ عالم آپ ہی ہیں اور خواہ مخواہ یہ دُور دراز کا سفر اختیار کیا۔ پھر جب نماز کا وقت ہوا آپ تشریف لائے اور امامت کرائی۔ جب سلام پھیرا تو میں نے آپ کا دامن پکڑ کر کہا۔ میں بے حد شرمندہ ہوں، براہِ کرم مجھے واپس لے چلیئے۔ آپ نے فرمایا: "اس شرط پر لے چلتا ہوں کہ جو کچھ یہاں دیکھا ہے، کسی کے سامنے بیان نہ کرنا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی ہے کہ مجھ کو دنیا میں خلقت سے پوشیدہ رکھیں۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۱۰)

اس اقتباس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ قطبِ عالم کا کوہِ لبنان سے بڑا گہرا تعلق ہے اور یہ تعلق اتنا مشہور و معروف ہے کہ آپ کے مرید کو بھی اس کا علم تھا۔

۲۔ کوہِ لبنان میں غالباً کوئی بہت بڑی مسجد ہے۔ جہاں جنازے بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ اس مسجد کی امامت قطبِ عالم ہی کے سزاوار ہے۔

۳۔ آپ خراقان سے مہینوں کا سفر لمحوں میں طے کر کے دن میں پانچ بار کوہِ لبنان پر آ کر امامت فرمایا کرتے تھے۔ جب کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک ماہ کا سفر طے کرنے میں ایک پہر یا تقریباً تین گھنٹے درکار ہوتے

تھے۔ لہٰذا آپ کی یہ کرامت حضرت سلیمان علیہ السلام کے معجزہ سے بہت بڑھ کر ہے۔

۴۔ حضرت سلیمان علیہ السلام صرف ایک مقام پر موجود ہوتے تھے لیکن شیخ خرقانی صاحب بیک وقت خرقان میں بھی موجود رہتے تھے اور کوہِ لبنان میں بھی موجود ہوتے تھے اور یہی ہمارے اولیاء اللہ کی وہ شان ہے جو انبیاء سے بڑھ کر ہے۔

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ

ہاتف غیبی یا ندائے غیبی

اسی طرح حضرت موسےٰ علیہ السلام کی ایک بہت بڑی فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بلا واسطہ فرشتہ کلام فرمایا۔ اور اس کا قرآن میں کئی جگہ ذکر فرمایا۔ اسی وجہ سے وہ کلیم اللہ مشہور ہوئے۔ لیکن ہمارے اولیائے کرام ہر وقت خدا سے مخاطب ہوتے، بالمشافہ سوال وجواب کرتے اور ہاتف غیبی کی آوازیں سنتے رہتے ہیں۔ اور ایسے واقعات اس کثرت سے ہیں کہ ان کا حصر ناممکن ہے۔ اور اس کتاب میں ضمناً بہت سے ایسے واقعات مذکور ہو بھی چکے ہیں۔ پھر کچھ اولیاء اللہ ایسے بھی ہیں کہ ندائے غیبی کے ساتھ ایک چمچہ بھی غیب سے برآمد ہوتا ہے۔ جس میں تیل ہوتا ہے۔ اور ندائے غیبی یوں پکارتی ہے کہ اس تیل کو درد کے مقام پر اس طرح لگاؤ۔ اور فلاں فلاں چیز کھاؤ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ باب زیرِ عنوان "نظام الدین عمری کا طریق تربیت۔"

یدِ بیضا

حضرت موسےٰ علیہ السلام کو ایک معجزہ دیا گیا تھا کہ اپنا ہاتھ بغل میں ڈالتے پھر باہر نکالتے تو وہ روشن ہو جاتا تھا، لیکن ہمارے اولیاء بغل میں بھی ہاتھ نہیں ڈالتے بلکہ انگلیوں پر صرف پھونک مار دیتے ہیں تو وہ دھک سے شمع کی مانند روشن ہو جاتی ہیں مثلاً:

"نقل ہے کہ ایک بار حضرت حسن بصری اپنے اصحاب کے ہمراہ حضرت رابعہ بصری کی زیارت کو گئے۔ ان کے پاس چراغ نہ تھا۔ آپ نے انگلیوں پر پھونک ماری۔ انگلیاں دھک سے شمع کی مانند روشن ہو گئیں۔" (مقربانِ حق، ص ۴۶)

یہ کرامت اس لئے غلط ہے کہ حضرت رابعہ اور حضرت بصری کی تاریخی اعتبار سے ملاقات بھی

ثابت نہیں کی جا سکتی۔ اور اس کی تفصیل ہم کسی دوسری جگہ پر لکھ چکے ہیں۔ پھر کچھ ایسے اولیاء اللہ بھی ہیں کہ ہر ایک مہمان کے لئے الگ الگ شمعیں روشن کرتے ہیں۔ پھر یہ شمعیں اتنی راسخ ہوتی ہیں کہ پھونک مارنے سے نہیں بجھتیں۔ حتیٰ کہ اوپر مٹی ڈالنے سے بھی نہیں بجھتیں۔ چنانچہ جب احمد خضرویہ کے ہاں ستّر درویش مہمان ہوئے تو آپ نے ان کے لئے ایسی ہی ستّر شمعیں روشن کی تھیں۔ اور ان شمعوں کا دوسرا کرشمہ یہ تھا کہ انہوں نے ۷۰ کافروں کے تاریک دلوں کو جا منور کیا تھا اور وہ اسلام لے آئے تھے (مقربانِ حق، ص ۱۸۰) اسی طرح ایک دفعہ ابوبکر شبلی نے انہیں صفات کی حامل چالیس شمعیں مہمانوں کے لئے روشن فرمائیں لیکن اِن شمعوں نے کسی کافر کے ظلمت کدہ کو روشن نہیں کیا تھا۔

(مقربانِ حق، ص ۱۵۲)

لاٹھی مارنے سے چشمہ پھوٹنا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ جب آپ کی قوم نے پانی کا مطالبہ کیا۔ پینے کو پانی دُور دُور تک کہیں نہ تھا۔ ادھر ستّر ہزار بنی اسرائیل پیاسے مر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ پتھر (یا پہاڑ) پر اپنی لاٹھی مارو، تو اس سے بنی اسرائیل کے قبیلوں کی تعداد کے تناسب سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ اس میدان میں بھی ہمارے اولیاء اللہ کسی سے کم نہیں رہے۔ "ایک دفعہ ابو یوسف سمان چشتی (م ۴۵۹ھ) اپنے ہمراہیوں کے ساتھ گرمیوں میں تشریف لے جا رہے تھے سخت گرمی کے وقت رفقاء کو پیاس لگی۔ پانی کہیں نہ تھا۔ حضرت نے اپنی لاٹھی پتھر پر ماری تو اس سے فوراً چشمہ ابلنے لگا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۰)

عصائے حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ کو علیہ السلام کو ایک معجزہ یہ بھی عطا ہوا تھا کہ وہ اپنا عصا پھینکتے تو اژدہا بن جاتا تھا۔ جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے۔ ایسی کوئی کرامت کسی ولی اللہ سے ظاہر نہیں ہوئی۔ نہ ہی کسی تذکرہ نگار نے بیان فرمائی۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ خود بھی ایسی کرامت سے ڈر جاتے ہوں۔ ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ کرامت بیانی کا اصل مقصد تو عوام کو پیروں کے جال میں پھنسانا ہوتا ہے۔ ایسی کرامت دیکھ کر اگر لوگ بدک جائیں تو ایسی کرامت دکھانے کا نو فائدہ کے بجائے نقصان ہوگا۔ ایسی کرامت سے اولیاء اللہ اور تذکرہ نگاروں نے پرہیز ہی مناسب سمجھی۔ وہ اپنے عصا کو البتہ روشن کر سکتے ہیں مثلاً:

پیرانِ پیر نے ہتھیلی پر سرسوں جماکر ایسا کرشمہ دِکھلادیا تھا "عبداللہ زیال کہتے ہیں کہ میں آپ کے مدرسہ میں کھڑا تھا آپ عصا لیئے باہر آئے کہ اس عصا سے کوئی کرامت دکھلائیں۔ آپ نے اسے پھینک کر سانپ نہیں بنایا، بلکہ زمین میں گاڑ دیا، تو وہ روشن ہوکر چمکنے لگا اور گھنٹہ بھر اسی طرح چمکتا رہا۔ اُس کی روشنی آسمان پر چڑھتی جاتی تھی۔ وہ جگہ نورٌ علیٰ نورٌ ہوگئی۔ (یعنی سورج کی روشنی بھی اور عصا کی بھی) گھنٹہ بعد آپ نے عصا زمین سے نکالا تو وہ اپنی پہلی حالت میں آگیا۔ پھر پیرانِ پیر نے فرمایا: "اے زیال ہم اسی چیز کے خواہشمند تھے۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۷۷۔ قلائد الجواہر، ص ۲۹۔ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۵۷)

اب بتلایئے اس کرامت نے کونسی اہم دینی یا دنیوی غرض پوری کی ہے ؟ اگر ایسا نہیں تو کیا اسے کرامت ہی کہیں گے ؟

دریا میں خشک راستہ بننا

حضرت موسےٰ علیہ السلام کو ایک معجزہ یہ بھی عطا ہوا تھا کہ آپ نے فرعون کے تعاقب کے وقت دریا پر اپنا عصا مارا تو پانی درمیان سے کٹ گیا اور پانی اپنی جگہ پر رُک گیا۔ اس میدان میں بھی ہمارے اولیاء اللہ حضرت موسےٰ علیہ السلام سے پیچھے نہیں رہے۔ ایک دفعہ دریائے دجلہ میں شدت کی طغیانی آئی اور لوگ حیران و پریشان ہوگئے۔ لوگوں کی استدعا پر پیرانِ پیر اپنا عصا لیئے دریا کی طرف چل پڑے اور کنارے پر پہنچ کر اپنا عصا دریا کی اصلی حد پر نصب کر دیا اور دریا کو فرمایا بس یہیں تک۔ یہ فرمانا ہی تھا کہ اسی وقت پانی کم ہوکر آپ کے عصائے مبارک تک آگیا۔ (بہجۃ الاسرار، ص ۷۶۔ قلائد الجواہر، ص ۴۸ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۶۲)

اب دیکھئے ! دریا کی شدید طغیانی سے دریا کے آس پاس کا سارا علاقہ زیرِ آب آیا ہوا تھا اور اسی وجہ سے لوگ پریشان تھے۔ ہم یہ تو مان لیتے ہیں کہ پیرانِ پیر پانی کے اوپر ہی اوپر چل کر دریا کے کنارے پہنچ گئے ہوں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پانی کی اصلی حد تک پانی میں آپ کا عصا نصب کیسے ہوگیا اور پانی کے اندر سے آپ کو کیسے معلوم ہوگیا کہ پانی کی اصلی حد یہ ہے۔ پھر آپ کے وہاں کھڑے کھڑے اتنا کثیر پانی فوراً اُڑ کر غائب بھی ہوگیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں سیلاب آیا تھا۔ پانی جمع تو چالیس دن میں ہوا مگر اُترنے میں چھ ماہ لگ گئے۔ مگر پیرانِ پیر پل بھر میں اتنا کثیر پانی غائب فرما دیتے ہیں۔ آخر پیرانِ پیر جو ہوئے۔

عبدالواحد بن زید کا دریا کو خشک کر دینا

"کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ کا کسی دریا پر گزر ہوا۔ ملاح اہلِ ثروت سے دام لے کر کشتی

پر بیٹھا رہا تھا اور جن کے پاس دام نہ تھے اُن کو چھوڑتا جاتا تھا آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ دریا سے عبدالواحد کی طرف سے کہہ دو کہ خشک ہو جاوے۔ اِن فقراء نے آپ کا پیغام پہنچا دیا۔ دریا اس قدر کم ہوگیا کہ لوگ بے تکلف گزر گئے۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۲۷)

اب دیکھئے کہ عبدالواحد خود دریا پر موجود ہیں۔ پھر بھی دریا کو پیغام اِن غریبوں کے واسطہ سے بھجواتے ہیں، جو آپ کے پاس ہی کھڑے تھے اور جنہوں نے آپ سے ایسی کوئی التجا تک بھی نہ کی تھی۔ پھر دریا جو پایاب ہوگیا تو جو لوگ کشتی پر سوار تھے وہ بھی اُتر آئے ہوں گے کیونکہ اب کشتی تو چل ہی نہ سکتی تھی اور ملاح جو مزدور بھی ہوتے ہیں آپ کو دُعائیں بھی دیتے ہوں گے کہ ان کی روزی کا ذریعہ چند فقراء پر اس ہمدردی اور کرامت کی وجہ سے ختم ہوگیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دریائے فرات کی طغیانی

"ایک دفعہ کوفہ کے نواح کے لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ دریائے فرات میں بڑی طغیانی آئی ہے اور ہماری فصلیں تباہ ہو گئی ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ پانی کا بہاؤ کوفہ کو بھی اپنی پیٹ میں نہ لے لے۔ دُعا فرمائیے کہ پانی حدِ اعتدال سے نہ بڑھے اور لوٹ جائے۔ آپ نے یہ شکایت سُنتے ہی سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جُبّہ پہنا۔ (یاد رہے کہ یہ جُبّہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عُمر رضی اللہ عنہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق پہلے ہی خواجہ اویس قرنی کو دے آئے تھے) پیراہنِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بغل میں لیا۔ عصائے محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ میں اور عمامہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سر پر رکھا اور شہریوں کے ہمراہ دریائے فرات کے کنارے پہنچ گئے۔ دو رکعت نماز ادا کی اور فرات کے کنارے کھڑے ہو کر اسی عصا سے دریا کی طرف اشارہ کیا۔ ایک اشارے سے ہی ایک گز پانی اُتر آگیا۔ اسی طرح آپ نے تین بار کیا اور تین گز پانی نیچے اُتر گیا۔ جب چوتھے گز کی نوبت آئی تو اہلِ شہر چلّا اُٹھے۔ "یا حضرت! اس سے کم نہیں ہونا چاہئے۔ نہیں تو ہم پانی سے محروم ہو جائیں گے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۶۱)

اب دیکھئے کہ:

۱ حضرت علی رضی اللہ عنہ دریائے فرات کے کنارے پہنچ کر دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ طغیانی کا قصہ سراسر غلط ہے، کیونکہ کنارہ تو زیرِ آب تھا۔ وہ طغیانی ہی کیا ہوتی جس میں لوگوں سمیت دریا کے کنارے پر پہنچ کر دو رکعت نماز ادا کر لی جائے۔ ان دونوں میں ایک ہی بات ہو سکتی ہے، یا

طغیانی ہی نہ آئی تھی یا پھر آپ نے کنارے پہنچ کر نماز ادا نہیں کی تھی یا پھر شاید پانی پر ہی مصلیٰ ڈال کر کرلی ہو۔

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود بھی کوفہ کے رہنے والے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ عصا سے اشارہ کرنے میں اتنے محو تھے کہ انہیں اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اگر چوتھی بار بھی عصا سے اشارہ کر دیا، تو پانی کہاں سے بہیں گے۔ لوگ چلائے تو پھر آپ عصا کے اشارہ سے رُکے۔ اگر لوگ نہ چلاتے تو عصا کے اشاروں سے دریا کو یکسر خشک ہی کر چھوڑتے، تو کیسا بُرا حال ہوتا۔

۴۔ متفرق کرامات جو معجزات کا چربہ ہیں

یا نارُ کونی برداً وسلاماً

یہ معجزہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔ جب آپ نے توحیدِ باری کی خاطر اپنے آپ کو آگ میں جھونک دیا جانا بھی گوارا کر لیا تب جا کر اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ دکھلایا اور آگ کو حکم دیا کہ "حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا۔" چنانچہ آگ گلزار بن گئی اور آپ اس میں سے صحیح سلامت باہر نکل آئے۔ لیکن رفاعی سلسلہ کے پیروں فقیروں نے اپنی ولایت کا معیار ہی یہ مقرر کیا ہوا تھا کہ وہ آگ میں کود جاتے اور آگ ان پر اثر نہیں کرتی تھی۔ اگرچہ امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی اس شعبدہ بازی کا پول کھول کے رکھ دیا تھا۔ مگر یہاں بحث یہ تو ہے ہی نہیں کہ ان کا یہ فعل شعبدہ بازی تھا یا کرامت۔ یہاں سوال یہ ہے کہ یہ اولیاء اللہ لوگوں کو ایسی کرامات دکھلا سکتے ہیں۔ اور جب چاہے دکھلا سکتے ہیں تو پھر ان کے طلسم کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معجزہ کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟

اسی طرح عثمان ہارونی صاحب (م ۶۱۷ھ) نے ایسا کرشمہ برنبائے دعویٰ اور محض اپنی ولایت کی نمائش کی خاطر دکھلا دیا تھا۔ ہوا یہ کہ:

"ایک دفعہ آپ آتش پرستوں کے شہر تشریف لے گئے اور نصیحت کی کہ "آگ قابلِ پرستش چیز نہیں اگر تم اس کی پوجا کرتے ہو تو بھی یہ تمہیں جلائے گی۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اگر اس کی پوجا نہ کرو گے تو یہ آخرت میں نہیں جلائے گی۔" وہ کہنے لگے "اچھا! آپ آگ کو نہیں پوجتے تو اس میں جا کر دکھلائیے کہ جلاتی ہے یا نہیں"۔ آپ نے یہ سُن کر وضو فرمایا اور دوگانہ ادا کیا اور سردار کے ایک کمسن بچے کو گود میں لے کر اس آگ میں

چلے گئے۔ اور دو گھنٹہ اس میں رہے۔ آگ نے بچہ تک میں کوئی اثر نہیں کیا۔ یہ ولایت ابراہیمی تھی، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معجزہ کا پرتو تھا۔ اس پر وہ سب کے سب مع اس سردار کے مسلمان ہو گئے۔" (تاریخ مشائخ چشت۔ مولانا زکریا، ص ۱۶۴)

اس اقتباس میں درج ذیل امور قابلِ غور ہیں:

۱۔ ولایتِ ابراہیمی کے الفاظ لاکر شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نے صوفیاء کے اس عقیدہ کی طرف واضح اشارہ فرمادیا کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے۔

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کافروں نے اپنے بتوں سے گستاخی کی سزا کے طور پر انتقاماً آگ میں جھونک دیا۔ آپ کو مجبوراً اور اضطراراً آگ میں جانا پڑا، لیکن ہارونی صاحب اپنی مرضی سے اور بربنائے دعوے اس میں داخل ہوتے ہیں۔

۳۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قطعاً یہ یقین نہ تھا کہ آگ ان پر کوئی اثر نہ کرے گی۔ وہ اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کرنے پر تیار تھے۔ جبکہ ہارونی صاحب کا مقصد کرامت کا اظہار تھا۔

۴۔ اس اقتباس میں یہ بات کہ "سردار کے بچہ کو ہارونی صاحب اپنے ساتھ آگ میں لے گئے۔" عقلاً محال ہے۔ کیونکہ سردار تو اپنا بچہ اسی صورت میں ہارونی صاحب کے حوالے کر سکتا تھا کہ اسے بھی ہارونی صاحب کی طرح پہلے یقین ہوتا کہ آگ اس پر کچھ اثر نہ کرے گی۔ اگر انہیں پہلے سے یقین ہوتا تو وہ ہرگز امتحان نہ لیتے۔

۵۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب آگ سے صحیح سلامت نکلے تو ایک شخص بھی اسلام نہ لایا، مگر جب ہارونی صاحب آگ سے صحیح سلامت نکلتے ہیں، تو سب کے سب مسلمان ہو جاتے ہیں۔ اب جس معاملہ کی ابتداء، مقصد اور نتیجہ سب میں تضاد ہو، تو پھر ہارونی صاحب کی یہ کرامت معجزۂ ابراہیمی علیہ السلام کا پرتو کیسے ہوا، بلکہ اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ ہارونی صاحب کی کرامت کے مقابلہ میں بالکل ہیچ تھا۔

آگ میں کودنے کی مقابلہ بازی

شیخ ابوالحسن خرقانی کا ذکر چل رہا ہے:

"ایک روز شیخ المشائخ ابوالعباس آپ (ابوالحسن خرقانی) کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ کے سامنے پانی کا بھرا ہوا ایک طشت رکھا تھا۔ شیخ المشائخ نے پانی میں ہاتھ ڈال کر ایک زندہ مچھلی نکال کر آپ کے سامنے رکھ دی۔ شیخ خرقانی کے قریب ایک گرم

تنور تھا۔ آپ نے اس میں ہاتھ ڈال کر ایک زندہ مچھلی شیخ المشائخ کے سامنے رکھ دی اور فرمایا کہ پانی میں سے مچھلی نکالنا آسان ہے۔ آگ سے نکالنی چاہیئے۔ شیخ المشائخ نے کہا۔ آؤ ہم دونوں اس جلتے ہوئے تنور میں کود پڑیں اور دیکھیں کہ کون اس میں سے زندہ نکلتا ہے۔ اس پر شیخ خرقانی نے فرمایا: "آؤ ہم اپنی نیستی میں غوطہ لگائیں اور دیکھیں کہ اس کی ہستی سے زندہ ہو کر کون باہر نکلتا ہے۔" یہ سن کر شیخ المشائخ ابوالعباس خاموش ہو گئے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۰۸)

اقتباس بالا سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ شیخ المشائخ کے لئے کم از کم اتنی کرامات ہونا ضروری ہیں کہ وہ (ا) پانی کے طشت میں ہاتھ ڈال کر زندہ مچھلی نکال سکتا ہو۔ (ب) دعوے کے ساتھ آگ میں کود جائے۔ پھر اس پر آگ کچھ اثر بھی نہ کرے۔

۲۔ شیخ خرقانی کے مقابلہ میں شیخ المشائخ کی یہ کرامات بالکل ہیچ تھیں کیونکہ آپ (ا) پانی کے بجائے آگ سے بھی دعوے کے ساتھ زندہ مچھلی نکال سکتے تھے۔ اور (ب) آگ لوگوں کو جلا کر مارتی ہے پھر بھی مادی جسم کے اجزاء کسی نہ کسی صورت میں باقی رہ جاتے ہیں۔ پوری نیستی نہیں ہوتی۔ شیخ المشائخ انہیں جلے ہوئے اجزاء سے غالباً دوبارہ زندہ ہو کر نکلتے ہوں گے، مگر شیخ خرقانی نے جو مکمل نیستی کے سمندر میں غوطہ لگانے کا ذکر کیا، تو شیخ المشائخ کے لئے چپ ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، کیونکہ شیخ خرقانی دعوے کے ساتھ نیستی کے سمندر میں غوطہ لگانے کے بعد بھی واپس آسکتے تھے۔

۳۔ ولایت کے اس مقابلہ میں شیخ المشائخ نے بالآخر زک اٹھائی اور اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ انہوں نے خود مقابلہ کی دعوت دی تھی۔

شیخ محمد فضیل قادری نوشاہی (م ۱۱۱۱ھ) اور چٹان کا پھٹنا

"دورِ نبوی میں جنگِ خندق کی کھدائی کے دوران ایک سخت چٹان آگئی۔ جس کی وجہ سے کھدائی رک گئی۔ ادھر دشمن سر پر آرہا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عاجز آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی، تو آپ نے گینتی پکڑ کر زور سے ضرب لگائی اور نعرۂ تکبیر بلند کیا، تو یہ سخت پتھر پاش پاش ہو گیا اور یہ آپ کا معجزہ تھا۔

اب شیخ محمد فضیل قادری، نوشاہی کی کرامت بھی ملاحظہ فرمایئے:

"نقل ہے کہ کابل کے ایک شاہی باغ میں پہاڑ کی ایک چٹان آگری۔ وہ اس قدر وزنی تھی کہ اٹھائے

نہیں اٹھتی تھی۔ باغبان لوگ آپ کی خدمت میں آئے اور چٹان اٹھانے میں مدد مانگی۔ آپ نے چٹان کے قریب کھڑے ہو کر "الّا اللہ" کا نعرہ لگایا۔ چٹان اسی وقت پھٹ گئی اور اُس کے ٹکڑے دُور دُور جا پڑے۔ زمین خالی ہو گئی۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۷۸)

اب دیکھئے یہ کرامت کئی لحاظ سے معجزۂ نبوی ﷺ سے بڑھیا ہے۔ ایک تو رسول اللہ ﷺ نے گینتی استعمال فرمائی، لیکن فضیل صاحب کو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ دوسرے خندق والی چٹان پھٹنے کے بعد وہیں کی وہیں رہی، لیکن شیخ صاحب کی پھٹی ہوئی چٹان کے ٹکڑے بھی دُور دُور پڑ کر زمین بھی خالی ہو جاتی ہے۔

۵۔ چند دلچسپ کرامات

یہاں ہم ایسی کرامات درج کریں گے، جو محض اولیائی کی نمائش کے لیے تیار کی گئی ہیں اور کوئی دینی یا دنیوی اہم غرض پوری نہیں کرتیں۔

حضرت ابراہیم بن ادھم کا ذکر ہو رہا ہے:

"نقل ہے کہ ایک بار آپ نے کنوئیں میں ڈول ڈالا۔ نکالا تو چاندی سے بھرا ہوا تھا۔ پھینک دیا۔ پھر ڈالا، تو سونے سے لبریز آیا، اُسے بھی اُلٹ دیا۔ پھر نکالا، تو موتیوں سے بھرپور تھا۔ کہنے لگے: "الٰہی! مجھے خزانہ نہیں چاہیئے، پانی چاہیئے تاکہ میں وضو کروں اور تیری بندگی بجا لاؤں۔" اللہ اللہ!" (مقربانِ

اب دیکھئے کہ حضرت ابراہیم بن ادھم کو ضرورت تو پانی کی ہے، وہ تو آتا نہیں اور سونے چاندی اور موتیوں کے ڈول نکلتے آ رہے ہیں۔ لہٰذا ایسی "کرامت" کرامت نہیں، کچھ اور ہی چیز ہے۔ یا پھر یہ واقعہ ہی من گھڑت ہے۔

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور گرا ہوا دہی

"ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ درہ ہاتھ میں پکڑے جا رہے تھے۔ ایک دہی فروش راہ میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ آپ نے پوچھا: "کیا ہوا؟" کہنے لگا: "میرا دہی زمین پر گر گیا۔ زمین اس دہی کو نگل گئی۔" حضرت عمرؓ کو اُس کی سادگی پر بڑا ترس آیا۔ آپ نے زمین پر دُرّہ مار کر کہا: "زمین! اس غریب کا دہی واپس کر دو۔ ورنہ انصاف کے درّے سے تمہیں سزا دوں گا۔" زمین اسی وقت پھٹ گئی اور وہ دہی جو نگل چکی تھی اس دہی فروش کو لوٹانے میں کامیاب ہو گئی۔ اُس نے اپنا برتن بھرا اور چلتا بنا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۵۶)

اب دیکھئے کہ :

۱۔ اگر دہی زمین پر گر جائے، تو زمین صرف اس میں موجود پانی کو جذب کرتی ہے۔ دہی کا اصل مواد زمین کے اوپر ہی رہتا ہے۔ چنانچہ جب دہی فروش نے کہا کہ میرا دہی زمین نگل گئی، تو حضرت عمر نے اس بات کو ماننے کے بجائے اس کی سادگی پر محمول فرمایا۔

۲۔ تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ترس کھانے کی وجہ سے اور زمین کے اس ظلم کی وجہ سے زمین کو درّہ مار ہی دیا۔ اور مزید سزا کی وعید بھی سنائی، تو زمین واقعی پھٹ گئی اور دہی جو کھا گئی تھی اسے واپس بھی لوٹا دیا۔ تب تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی یقین آ گیا ہو گا کہ دہی فروش سادہ ہی نہ تھا بلکہ سچا بھی تھا۔

۳۔ اب جو دہی فروش نے دہی سے اپنا برتن بھرا، تو اس میں تو زمین کے مٹی کے ذرات بھی ضرور شامل ہوں گے۔ اس بات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انصاف حرکت میں نہ آیا کہ دہی فروش اپنی دہی کے ساتھ مٹی کے ذرات بھی لے گیا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ زمین دُرّہ کھا چکی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے پر ظلم کی شکایت ہی نہ کی ہو گی۔

۳۔ سری سقطی کی بھنگن

"ایک روز شیخ کی بہن آئی۔ دیکھا کہ گھر میں ہر طرف کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا ہے، شیخ سے جھاڑو دینے کی اجازت مانگی۔ آپ نے اجازت نہ دی۔ دوسرے روز شیخ کی بہن پھر آئی۔ دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت گھر میں جھاڑو دے رہی ہے۔ کہا "سبحان اللہ! مجھے تو جھاڑو دینے کی اجازت نہ دی مگر اس نامحرم عورت کو دے دی۔" فرمایا: "اے ہمشیر! یہ بوڑھی عورت نہیں ہے، یہ دنیا ہے، جو سب کے عشق میں جلتی تھی اور مجھ سے محروم تھی۔ اب اس نے اللہ سے چاہا کہ اپنا نصیبہ مجھ سے حاصل کرے۔ اس لئے اس کو میری جاروب کشی کا حکم ہوا ہے۔" (خزینۃ الاصفیا ص ۱۳۲)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ :

۱۔ سری سقطی گھر میں رہائش پذیر تھے۔ بس عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ گھر کی صفائی کا مطلق خیال نہ ہوتا تھا۔ نہ آپ کو نہ آپکے گھر والوں کو۔ بس ہر طرف کوڑا کرکٹ ہی بکھرا رہتا تھا۔

۲۔ دنیا بڑی مدت سے اس عاشقِ الٰہی کے عشق میں جل رہی تھی اور شیخ سے اپنا نصیبہ حاصل کرنے کی دعا بھی کرتی رہی تھی، مگر اس کی یہ دعا اسی روز ہی قبول ہوئی، جب آپ کی بہن نے شیخ کے گھر میں کوڑا کرکٹ کا ڈھیر دیکھا۔

۴۔ شاہ مقیم حجرہ والے کا دردِ زہ کا علاج

"نقل ہے کہ آپ کے برادرِ حقیقی کی بیوی کو وضع حمل کے وقت شدت کا درد ہوا۔ شاہ مقیم صاحب سے دُعا کی درخواست کی گئی تو فرمایا: "انشاء اللہ درد دُور ہو جائے گا اور نہ رہے گا۔" آپ کی زبان سے یہ لفظ نکلتے ہی آپ کی بھاوجہ کا حمل غائب ہو گیا اور جب تک زندہ رہیں، حاملہ نہ ہوئیں۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۴۹)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ سے دُعا کی درخواست کی گئی، تو آپ سخت جلالت میں تھے کہ دُعا، بد دعا سے بدل گئی اور بیچاری بھاوجہ کو ہمیشہ کے لئے بانجھ بنا دیا۔ دراصل خاندانی منصوبہ بندی والوں کو ایسے اولیاء اللہ کی بہت ضرورت ہے، مگر افسوس یہ محکمہ دیر بعد معرض وجود میں آیا ہے۔

۵۔ میاں میر بالا پیر اور سانپ کا طواف

"ایک روز آپ دریائے راوی کے کنارے بیٹھے تھے کہ ایک مارِ سیاہ آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور ایسی زبان میں گفتگو کی جسے کوئی اور نہ سمجھ سکتا تھا۔ پھر تین بار آپ کے گرد طواف کیا اور لوٹ گیا۔ حاضرین کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا: "سانپ یہ کہتا تھا کہ میں نے عہد باندھ رکھا تھا کہ جب آپ کو دیکھوں گا، تو تین بار آپ کا طواف کروں گا۔ میں نے اجازت دے دی اور وہ طواف کر کے چلا گیا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ۲۳۰)

اب دیکھئے کہ:

۱۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو صرف منطق الطیر سکھلائی گئی تھی، لیکن بالا پیر سانپوں کی بولی بھی سمجھتے تھے۔

۲۔ کسی جاندار نے کسی نبی کا طواف نہیں کیا، کیونکہ طواف ایک عبادت ہے جو صرف اللہ کے گھر کے لئے سزاوار ہے، لیکن سانپ نے اس شرکیہ فعل کا عہد باندھا تھا۔

۳۔ سانپ ایک غیر مکلف مخلوق ہے جسے شرعی عبادات کا نہ علم ہو سکتا ہے نہ شعور۔ لہٰذا یہ قصہ ہی سراسر غلط ہے۔

۴۔ ان سب باتوں کو اگر درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو بتلایئے کہ اس سے کون سی اہم دینی یا دنیوی غرض پوری ہوئی۔ سوائے اس کے کہ میاں میر صاحب کی ولایت کی نمائش ہو۔ پھر یہاں سندِ ولایت کی ضرورت بھی نہیں۔ کیونکہ حاضرین آپ کو پہلے ہی ولی سمجھتے تھے۔

بات وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ طبقہ عوام پر اپنی اولیائی کی دھاک بٹھلانے کے لئے ایسی کرامتیں تراشتا اور پھر انہیں مشہور کرتا رہتا ہے۔

باب (۹)

دلائل صوفیاء

اس باب میں ہم ایسی باتوں کا ذکر کریں گے جن کی کچھ نہ کچھ صورت شریعت میں موجود ہے ہمارے صوفیہ نے ان امور میں غلو سے کام لے کر اور انہی امور کو پوری شریعت سمجھ کر ان پر دین طریقت کا محل کھڑا کر دیا ہے۔ پھر اس دین طریقت کو شریعت ہی سے ماخوذ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ مجاہدہ اور ریاضت

مجاہدہ وریاضت کو جائز ثابت کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کے قبل از بعثت غارِ حرا میں تشریف لے جانے اور وہاں قیام فرمانے سے استدلال کیا جاتا ہے۔ یہ استدلال کئی لحاظ سے غلط ہے، مثلاً:

۱۔ یہ واقعہ قبل از بعثت کا ہے، جو حجت نہیں بن سکتا۔ پھر آپ نے اس قسم کے مجاہدہ سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو سختی سے منع بھی فرما دیا، جو صوفیوں کے ہاں رائج ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی اس قسم کا مجاہدہ نہیں کیا۔ نہ ہی آپ نے کبھی ایسا مجاہدہ کیا۔ گویا آپ کو پہلی وحی کے بعد ہی ایسے مجاہدہ سے اٹھا لیا گیا تھا۔

۲۔ غارِ حرا آپ کے گھر سے صرف چند میل کے فاصلہ پر تھا۔ آپ ہر تیسرے چوتھے دن گھر تشریف لاتے تھے اور گھر سے آب و دانہ ساتھ لے جاتے تھے۔ پھر آپ نے اپنی بیوی اور بال بچوں سے بھی تعلق منقطع نہیں کیا تھا۔ جبکہ ہمارے بزرگ کئی کئی سال جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ نکاح نہیں کرتے اور اگر پہلے سے شادی شدہ ہوں تو بیوی بچوں سے تعلق منقطع کر لیتے ہیں۔ پھر آب و دانہ کا انتظام تو درکنار، یہ نفس کو مارنے کے لئے بھوکوں رہنا پسند فرماتے ہیں۔ ان کے ہاں جو مقولہ معراج الفقراء الجوع رائج ہے۔ یہ اس کی پابندی ضروری خیال کرتے ہوئے ایسے فقر کے متلاشی ہوتے ہیں جس کی سرحدیں قدیم رہبانیت سے ملتی ہیں۔ اسلامی فقر سے ان کا چنداں تعلق نہیں ہوتا۔

لہ۔ دیکھئے باب (۲) میں عبادات میں غلو کے تحت

۳۔ آپؐ غارِ حرا میں جاکر ذکر و فکرِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے جبکہ یہ حضرات مختلف اوراد و وظائف کے چلوں کے ذریعے تسخیرِ جنات اور کرامات کے حصول کا فن سیکھتے ہیں۔

اب ان اولیاء اللہ کے مجاہدات کا مختصر ذکر بھی ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) تیس سال تک شام کے جنگلوں میں ریاضت مجاہدہ کرتے رہے۔ ایک سال آپ (بسطام سے) حج پر گئے تو ہر قدم پر دوگانہ ادا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بارہ سال میں مکہ معظمہ پہنچے اور فرمایا کہ "دنیا کے بادشاہ کی بارگاہ نہیں، جو یکبارگی چلا جاتے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۸۹)

۲۔ عبدالواحد بن زید (م ۱۷۸ھ) آپ نے بیعت سے قبل چالیس سال مجاہدہ کیا۔ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۲۲)

۳، ۴۔ ابوہبیرہ بصری (م ۲۸۷ھ) اور علو ممشاد دینوری (م ۲۹۸ھ) دونوں نے تیس تیس سال مجاہدہ فرمایا۔ (ایضاً ص ۱۴۷ - ۱۴۹)

۵۔ شریف زندنی (م ۵۸۰) چالیس سال ایک متوحش جنگل میں قیام فرمایا اور درختوں کے پتوں پر گزارا کرتے رہے (ص۱۶۰)

۶۔ عثمان ہارونی (م ۶۰۳) آپ نے ستر (۷۰) سال مجاہدہ فرمایا۔ ساتویں دن منہ بھر پانی پیتے تھے۔ (ایضاً ۱۶۳)

۷۔ نظام الدین عمری (م ۱۰۲۴) نے اس قدر سخت مجاہدہ کیا کہ حجرہ کے دروازہ پر دیوار کھینچ لی تھی اور اندر ہی مہینہ بھر تک رہے۔ (ایضاً ۲۱۴)

۸۔ پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۶۱ھ) فرماتے ہیں کہ "مدت مدید تک شہر کے ویران اور بے آباد مقامات پر زندگی بسر کرتا رہا، پچیس سال تک عراق کے جنگلوں میں تنہا پھرتا رہا۔ ایک سال تک ساگ، گھاس اور پھینکی ہوئی چیزوں پر گزارا کرتا رہا اور پانی مطلقاً نہ پیا۔ پھر ایک سال تک پانی بھی پیتا رہا۔ پھر تیسرے سال صرف پانی پر گزارا رہا پھر ایک سال نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ ہی سویا۔" (طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۱۲۹، جامع کرامات اولیاء، ج ۱، ص ۲۰۲۔ قلائد الجواہر ص ۱۰، بحوالہ غوث الثقلین، ص ۸۳)

غالباً پہلے بزرگ جنہوں نے مجاہدہ کے لئے الٹا لٹکنا بھی ضروری سمجھ کر اس کا آغاز فرمایا وہ خواجہ محمد چشتی ہیں۔ چنانچہ صاحب سیر الاولیاء لکھتے ہیں کہ :

۹۔ **معکوس لٹک کر عبادتِ الٰہی کرنا** - منقول ہے کہ خواجہ محمد چشتی (م ۴۱۱ھ) اکثر اوقات عالم تحیر میں ڈوبے رہتے تھے اور سالہا سال آپ کا مبارک پہلو زمین پر نہ پہنچا۔ آپ مجاہدہ کے انتہائی درجہ اور غلبہ شوق میں سرنگوں ہو کر عبادت کرتے تھے۔ آپ کے مکان میں ایک عمیق اور گہرا کنواں تھا۔ اس میں الٹے لٹک کر عبادتِ الٰہی میں مصروف

رہتے۔" (سیر الاولیاء، ص ۴۶)

پھر بعض اولیاء اللہ ایسے بھی پیدا ہوئے جنہوں نے مجاہدہ میں معکوس لٹکنے کے علاوہ حبس دم کو بھی ضروری سمجھا صاحب خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں کہ :

۱۰۔ شیخ عبدالرحمٰن نوشاہی (م ۱۱۵۲ھ) "مجاہدہ یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ تمام رات بہ حبس دم ذکر خفی کرنے اور بعض اوقات معکوس الٹک کر رات بھر ذکر میں مشغول رہتے۔ خلوت اختیار کرتے تو قبر کھدوا کر اس میں بیٹھ جاتے اور اوپر سے بند کرا دیتے۔ چالیس چالیس روز ایسی حالت میں مراقبہ اور ذکر و فکر میں محو رہتے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۰۵)

اب آپ خود ملاحظہ فرمالیجئے کہ ان حضرات کے مجاہدہ و ریاضت اور رسول اللہ کے قیام غار حرا میں کوئی نسبت ہے؟

۲۔ بیعت

بیعت دین طریقت میں شمولیت کے لئے لازمی امر اور اس کا اہم رکن ہے۔ لیکن اسلام میں اس بیعت کی یہ اہمیت ہرگز نہیں۔

بیعت دو قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) بیعت، اطاعت خلیفہ یا امیر : اسلام میں یہ بیعت ضروری قرار دی گئی ہے تاکہ مسلمان تشتت و انتشار کا شکار نہ ہوں۔ اسی لئے آپ کا ارشاد ہے : "کہ اگر دو خلیفوں کی بیعت ہونے لگے، تو بعد والے کو قتل کر دو۔" ظاہر ہے کہ اس قسم کی بیعت کا اطلاق ان اولیاء اللہ کی بیعت پر نہیں ہو سکتا اور اس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں :

۱۔ اس پورے شجرہ طریقت میں کوئی بزرگ ایسا نہیں جسے زمام کار یا خلافت نصیب ہوئی۔ یہ حضرات حسن بصری کے ذریعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تک سلسلہ ملاتے تو ہیں، مگر محدثین اور محققین کے نزدیک ان کی ملاقات بھی ثابت نہیں۔

۲۔ اس سلسلۂ طریقت میں کئی ایک بزرگ بیک وقت موجود ہوتے ہیں اور الگ الگ بیعت لیتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان حضرات کی بیعت کا اس بیعت سے چنداں تعلق نہیں، جسے اسلام میں امام کی اطاعت کے سلسلہ میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ایسی بیعت صرف ایک ہی امام کی ہو سکتی ہے۔

پھر ایسی بیعت بھی مملکت کے تمام مسلمانوں کے لئے ضروری نہیں۔ بلکہ دارالخلافت کے مسلمانوں کی بیعت تمام مملکت کے مسلمانوں کی بیعت سمجھی جاتی ہے گی۔

دوسری قسم کی بیعت کسی بھی بزرگ کے ہاتھ پر کسی نیکی کے کام یا خدا کے احکام کی تعمیل کی شکل میں ہو سکتی ہے۔ مثلاً :

۱۔ بیعت رضوان : یہ وہ بیعت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر موجود صحابہ سے جان کو جان آفرین کے سپرد کرنے کے سلسلہ میں لی تھی۔ یہ بیعت بھی ان اولیاء اللہ کے کام کی چیز نہیں۔ کیونکہ یہ حضرات

جہادِ اکبر (نفس کشی) کے مقابلہ میں جہادِ اصغر (جہاد بالسیف یا جان جانِ آفرین کر دینے) کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔

۲۔ بیعتِ نسواں : یہ بیعت رسول اللہ نے چند شرعی احکام کی پابندی پر لی تھی۔ جن کا ذکر قرآن کریم میں مذکور ہے۔ تمام مسلمان عورتوں سے یہ بیعت نہیں لی گئی۔ لیکن جس قسم کی غیر مشروط اطاعت (یعنی غیر شرعی احکام کی تعمیل) یہ بزرگ حضرات اپنے مریدوں سے لیتے ہیں۔ اس قسم کی بیعت قطعاً حرام ہے۔ جس کی چند مثالیں ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

بیعت اگر مسنون طریقہ سے احکامِ شرعیہ کی پابندی کی بنیاد پر کی جائے، تو اس کا فائدہ ضرور ہے۔ بیعت لینے والا مرشد مرید پر نظر رکھتا ہے اور مرید بھی ایفائے وعدہ اور یادگیری کی بناء پر اس کا پاس رکھتا ہے، لیکن اس فائدہ کے باوجود یہ بیعت اسلام میں ضروری قرار نہیں دی گئی۔ اویس قرنیؒ کو رسول اللہ ﷺ نے مسلمان ہی نہیں خیر التابعین کے لقب سے نوازا۔ حالانکہ اویس قرنیؒ نے آپ کی بیعت تو درکنار، آپ کو دیکھا تک نہ تھا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام میں اس بیعت کو لازم قرار نہیں دیا گیا۔ جبکہ دینِ طریقت میں بیعت اہم رکن سلوک سمجھا جاتا ہے۔ جس کے بغیر سلوک کی منازل طے کرنا ممکن نہیں۔

اویسی نسبت

بیعت کے سلسلہ میں صوفیہ نے ایک اور شاندار کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ اویس قرنیؒ نے رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھا نہ بیعت کی، تو اُن کی ارواح کی آپس میں بیعت کروا دی۔ اور اسے نسبتِ اویسیہ کا نام دیا اور راستہ کی اس رکاوٹ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ فلاں شیخ کی فلاں شیخ سے ملاقات ہی ثابت نہیں، یا پیر کی وفات کے بہت عرصہ بعد مرید کی پیدائش ہو تو وہ یہی نسبتِ اویسیہ[1] قائم کر کے اپنا سلسلہ جاری فرما کر

---

[1] چنانچہ پیران پیر براہِ راست رسول اللہ ﷺ کے اویسی ہیں۔ اسی طرح ابوالحسن خرقانی بایزید بسطامی کے اویسی ہیں۔ حالانکہ ان میں چھ واسطے ہیں جو اس طرح ہیں۔ ابوالحسن خرقانی۔ ابومظفر۔ ترک طوسی۔ خواجہ اعرابی خواجہ محمد مغربی۔ بایزید بسطامی۔ لیکن سلسلۂ طریقت میں بایزید کے بعد فوراً دوسرا نمبر ابوالحسن کا آجاتا ہے (صوفیائے نقشبند ص ۱۰۳) اسی طرح حضرات ایشاں کی خواجہ بہاؤالدین نقشبند سے نسبتِ اویسیہ تھی (ایضاً ۲۶) پھر ولایت کی طرح نسبت میں بھی عزل و نصب کا سلسلہ چلتا ہے یعنی اولیاء اللہ دوسرے اولیاء کی یہ نسبت سلب بھی کر لیتے ہیں مثلاً مولانا درویش محمد (م ۹۷۰ھ) سے جب کوئی درویش ملنے آتا تو آپ اُس کی نسبت سلب کر لیا کرتے تھے (ایضاً ص ۱۸۵) اسی طرح شیخ محمد طاہر بندگی لاہوری بھی (م ۱۰۵۶ھ) بھی دوسروں کی نسبت چھین لیا کرتے تھے۔

پھر یہ اویسی سلسلہ صرف نسبت میں ہی نہیں چلتا۔ خلافت میں بھی چلتا ہے۔ گویا ابوالحسن خرقانی بایزید کے اویسی خلیفہ ہیں۔ ان صوفیاء نے خلافت کے سات مندرجہ ذیل طریق اختیار کر رکھے ہیں۔ جن میں آخری طریق "اویسی" ہے۔

خلافت کے سات طریق

۱۔ اصالۃً ــــ جب کوئی شیخ اللہ کے حکم سے کسی کو خلیفہ بنائے، اسے خلافتِ الٰہی کہتے ہیں۔ ۲۔ اجازۃ ــــ جب کوئی شیخ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کام چلا لیتے ہیں۔

۳۔ توجہ یا تصرّفِ باطنی

توجہ اور تصرفِ باطنی کو مشروع اور اس کے ذریعہ حصولِ فیض کو درست ثابت کرنے کے لئے مولانا اللہ یار خاں صاحب نے اپنی کتاب دلائل السلوک میں پانچ واقعات سے استشہاد فرمایا ہے۔ جن میں سے پہلے چار درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رُوح القدس سے تائید فرمائی۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے دُعا کی کہ "یا اللہ! حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی رُوح القدس کے ذریعہ تائید فرما۔

۳۔ جنگِ بدر میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو فرشتوں کی تائید سے ثابت قدم رکھا۔

۴۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی بار وحی ہوئی، تو جبریل علیہ السلام نے آپ سے کہا کہ "اِقْرَأْ" تو آپ نے فرمایا کہ مَا أَنَا بِقَارِئٍ۔ دوسری بار بھی ایسا ہی سوال و جواب ہُوا۔ پھر حضرت جبریل علیہ السلام نے آپؐ کو سینہ سے لگا کر بھینچا جس کا اثر یہ ہوا کہ تیسری بار جب جبریل علیہ السلام نے "اقرأ" کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ بھی سینہ سے لگا کر بھینچنا بھی دراصل توجہ اور تصرفِ باطنی ہی کی قسم سے تھا۔

ان مندرجہ بالا چاروں واقعات سے استشہاد درست نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ سب فرشتوں کا عمل ہے جو مامور من اللہ ہوتے ہیں اور اس کے حکم سے سرتابی بھی نہیں کر سکتے۔ اسی لئے فرشتوں کے عمل کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف ہی منسوب فرماتے ہیں۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ تو ایسی توجہ کے بغیر بھی حصولِ فیض سے بہت زیادہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ان واقعات سے پیر اور مرید کے درمیان توجہ اور باطنی تصرف اور حصولِ فیض کو کیونکر ثابت کیا جا سکتا ہے۔

لے دے کے ایک پانچواں واقعہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا رہ جاتا ہے جس میں ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اور دوسری طرف حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔ اس لئے اس واقعہ پر ہم ذرا تفصیل سے بات

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ سے)
اپنی مرضی سے کسی کو خلیفہ بناتے، اسے خلافتِ رضائی کہتے ہیں۔ اور یہ عام ہے۔ ۳۔ اجماعاً ــــ جب شیخ کی وفات کے بعد قوم کسی وارث یا مرید کو خلیفہ بنائے، اسے خلافتِ قبرائی کہتے ہیں۔ یہ بزرگوں کے ہاں غیر معتبر ہے۔ ۴۔ وارثاً ــــ مرنے کے بعد کسی نااہل وارث کی خلافت۔ یہ بھی غیر معتبر ہے اِلّا یہ کہ باطن میں فوت شدہ شیخ اس کا حکم دے۔ ۵۔ حکماً ــــ حاکم وقت کسی کو فوت شدہ شیخ کا قائم مقام بنا دے۔ یہ بھی معتبر ہے۔ ۶۔ تکلفاً ــــ وہ خلافت جو جماعت کی سفارش سے حاصل ہو۔ ۷۔ اویسیہ ــــ وہ خلافت جس میں تربیت بروحِ غیر ہو۔ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۲۴۱)

کریں گے۔ آپ نے مشکوٰۃ ص ۱۹۲ کے حوالہ سے متعلقہ حدیث کا ٹکڑا بمعہ ترجمہ نقل فرمایا ہے، جو یہ ہے :

فَسَقَطَ فِیْ نَفْسِیْ مِنَ التَّکْذِیْبِ وَلَا اِذْ کُنْتُ	حضرت ابی بن کعبؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اسلام کی تکذیب زمانۂ
فِی الْجَاهِلِيَّةِ فَلَمَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	جاہلیت سے بھی زیادہ میرے دل میں واقع ہوگئی جب رسول اللہ
مَاقَدْ غَشِيَنِيْ مَضَرَبَ فِيْ صَدْرِیْ فَفِضْتُ عِرَقًا	صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا تو میرے سینے پر ہاتھ مارا تو میں پسینہ
وَكَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَى اللّٰهِ[1] (دلائل السلوک ص ۱۱۱)	پسینہ ہوگیا اور حالت یہ ہوگئی کہ گویا میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔

بعد ازاں آپ نے صاحب مرقاۃ (شارح مشکوٰۃ) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آپ کے سینہ میں ہاتھ مارنے سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو مقامِ مشاہدہ و حضور حاصل ہوگیا۔ پھر اس واقعہ اور تشریح سے درج ذیل نتائج پیش کئے گئے ہیں :

۱۔ توجہ کی غرض غفلت کو دور کرنا اور نورِ ایمان کو تیز کرنا ہوتا ہے۔ ۲۔ توجہ سے انکشاف ہوتا ہے۔

۳۔ مجاہدات اور ریاضت کے ذریعے سالہا سال میں بھی اتنا فائدہ نہیں ہوتا جو شیخ کی تھوڑی سی توجہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔

۴۔ شیخ کی توجہ کے بغیر محض مجاہدات سے منازلِ سلوک طے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ تصوف اور سلوک القائی اور انعکاسی عمل ہے۔

۵۔ توجہ کے لئے قلب میں قبولیت کی استعداد ہونا ضروری ہے۔ اس لئے اس اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں کہ ابوطالب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصرف کیوں نہ کیا ؟

اب دیکھئے کہ :

۱ اِن نتائج میں مولانا موصوف نے بار بار توجہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ حالانکہ یہ تادیب و تعزیر کا عمل تھا۔ آپ نے

---

[1] واضح رہے کہ حدیث کا صرف اتنا ٹکڑا نقل کرنے میں بھی آپ نے چار مقامات پر غلطی کی یا تصرف فرمایا ہے۔ مثلاً

(۱) مَضَرَبَ کی جگہ اصل لفظ ضَرَبَ ہے۔ (۲) فِضْتُ کی جگہ اصل لفظ فِضْتُ ہے (۳) کَاَنِّیْ کے بجائے اصل لفظ کَاَنَّمَا ہے (۴) انظر الی اللہ کے بعد آپ نے فَرَقًا کا لفظ درج نہیں فرمایا جس کا معنیٰ غزنوی مترجم مشکوٰۃ میں "ڈر کی وجہ سے" اور منجد میں فَرِقَ فَرَقًا کے معنی گھبرانا اور ڈرنا درج ہے۔ (دیکھئے مسلم کتاب فضائل القرآن۔ باب بیان ان القرآن انزل علی سبعۃ احرف)

صوفیاء کی یہ بے احتیاطی یا غفلۃ الصالحین تو قرونِ اولیٰ سے زبان زد ہے۔ اب اگر صرف نقل کے معاملہ میں بھی مولانا اللہ یار خان جیسے مولانا کی کتاب کا یہ حال ہو تو دوسرے تذکرہ نگاروں کا حال آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سینہ پر ہاتھ مارا جس کی وجہ سے آپ گھبرا بھی گئے تھے۔

کیا ہمارے ہاں مروجہ سلسلہ ہائے طریقت میں ایسی توجہ کسی مُرشد نے اپنے مرید پر فرمائی ہے ؟ اور اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر آپ کے اس عمل پر توجہ کا اطلاق کیسے ہوسکتا ہے ؟

۲۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو حضور اور مشاہدہ کا مقام حاصل ہوگیا تھا۔ اب کسی بات کے فی الواقعہ "ہونے" اور "گویا کہ ہونے" میں ۔ جیسا کہ "کَاَنَّمَا" کے لفظ سے ظاہر ہے ۔ جو فرق ہے وہ واضح ہے اس کی مثال یُوں سمجھئے کہ حدیثِ جبریل میں ہے کہ "احسان یہ ہے کہ تُو عبادت اس طرح کرے گویا کہ تُو اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکثر صحابہ کی عبادت ایسی ہی تھی۔ پھر کہیں یہ بھی منقول ہے کہ وہ فی الواقعہ اللہ کو عبادت کے وقت دیکھتے تھے ؟ یا انہیں صوفیا، کا تجویز کردہ مقام حضور و مشاہدہ حاصل ہوگیا تھا ؛

۳۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ رسول اللہ کا یہ عمل توجہ ہی کی ایک قسم تھا اور یہ بھی فرض کرلیں کہ اسلام کا منشائے مقصود سلوک و تصوّف کی منازل طے کرانا اور مقام حضور و مشاہدہ تک، اس سے آگے، مقام فنا فی اللہ تک لے جانا ہے، تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اور صحابی پر ایسی توجہ فرمائی تھی ؟ کیا باقی سب صحابہ بھی ابوطالب کی طرح اس توجہ کی قبولیت کی استعداد نہ تھی ؟

۴۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس "توجہ" سے مقام حضور و مشاہدہ پر پہنچ جاتے ہیں، صوفیہ کا کوئی بھی سلسلہ اپنے شجرہ طریقت کو آپ تک نہیں پہنچاتا اور جن صحابہ کو یہ حضرات اپنے شجرہ طریقت میں یا اپنے تذکروں میں شمار کرتے ہیں مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ یا حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ان میں سے کسی پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی توجہ ثابت نہیں۔

۵۔ مروجہ سلسلہ ہائے طریقت میں "توجہ" سے پہلے بیعت بھی ضروری ہے۔ بیعت کے بغیر توجہ کا کوئی امکان نہیں اور اس بیعت کا بھی ایک مخصوص طریق مروج ہے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے اس مخصوص طریقہ کی بیعت لیا کرتے تھے ؟ اور بالخصوص آپ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ایسی بیعت لینے کے بعد "توجہ" فرمائی تھی ؛ علاوہ ازیں منازلِ سلوک طے کرانے کے لئے مرشد کو کئی بار اور مسلسل توجہ کرنا پڑتی ہے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل سے پہلے یا بعد پھر کبھی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر ایسی توجہ فرمائی تھی ؟ مرشدِ کامل تو اپنے صاحبِ استعداد مریدوں پر بار بار توجہ ڈالتے رہتے ہیں۔

بات سیدھی سی تھی جسے مولانا نے خواہ مخواہ پُرپیچ بنا دیا۔ ہوا یہ تھا کہ اختلافِ قرأت کی بنا پر حضرت ابی بن کعب

کو ایسا تردد لاحق ہوا کہ انہیں اللہ کے قرآن نازل کرنے اور آپ کی رسالت پر بھی شک ہونے لگا تھا رسول اللہ نے یہ کیفیت بھانپ لی اور آپ کے سینہ پر ہاتھ مارا جس سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو انشراح صدر ہو گیا اور اللہ، قرآن کے نازل کرنے والے پر ایسا پختہ یقین ہو گیا جیسا کہ عین الیقین کی بنا پر ہوتا ہے اور اس درجہ کا ایمان دوسرے بھی بہت سے مومنوں کو نصیب ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زندگی بھر کے اس ایک عمل کو بھلا صوفیاء کے معمولاتِ توجہ سے کیا تعلق ؟ جس کے ذریعہ مریدوں کو بار بار توجہ کرنے سے ایک منزل سے دوسری پھر دوسری سے تیسری منزل تک پہنچایا جاتا ہے۔

۴۔ مشاہدۂ حق

ہم پہلے باب میں بیان کر آئے ہیں کہ اس دنیا میں اللہ تعالٰی کا دیدار ممکن نہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر بھی اس دیدارِ الٰہی کی تاب نہ لا سکے تو اور کسی کی کیا مجال ہے ؟ لیکن ہمارے صوفیاء کرام بضد ہیں کہ دیدارِ الٰہی صرف ممکن ہی نہیں، بلکہ بڑے بڑے بزرگوں کو ایسا دیدارِ الٰہی ہوتا بھی رہتا ہے

اب ان کے دلائل یا تاویلات ملاحظہ فرمائیے : اسی آیہ لن ترانی کی تاویل کرتے ہوئے صاحب تفسیر رُوح البیان لکھتے ہیں :

دیدارِ الٰہی کا قرآنی ثبوت (تاویل نمبر ۱)

وَ اِنَّكَ اِذَا نَظَرْتَ بِكَ اِلَيَّ لَنْ تَرَانِيْ لِاَنَّهٗ لَا يَرَانِيْ اِلَّا مَنْ كُنْتُ لَهٗ بَصِيْرًا فِيْهِ يُبْصِرُ	اور تو جب اپنے ساتھ میری طرف نظر کرے گا تو مجھے نہ دیکھ سکے گا۔ کیونکہ مجھے وہی دیکھ سکتا ہے جس کے لئے میں خود بصیر ہوں۔ پھر وہ اس (بصارت) کے ساتھ دیکھے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ کوئی اس کو اپنے ساتھ دیکھے گا تو نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے ساتھ اسی کو دیکھے گا۔"

(ریاض السالکین، ص ،، بحوالہ تفسیر رُوح البیان، ص ،۷۷، جلد ۱، سطر ۱)

اس گورکھ دھندے کو کچھ سمجھے آپ ؟ اگر نہیں سمجھے تو کوئی بات نہیں۔ جب یہ گورکھ دھندا حضرت موسےٰ خود بھی نہ سمجھ سکے، تو پھر ہمارا اور آپ کا ذکر ہی کیا ہے ؟ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام ان صوفیانہ اسرار و رموز کو جانتے ہوتے تو شاید اللہ تعالٰی کا دیدار فرما لیتے اور مایوس نہ ہوتے مگر وہ تو اپنے ساتھ اللہ کو دیکھ رہے تھے۔ اگر اللہ کو اللہ کے ساتھ دیکھتے تو ضرور کامیاب ہو جاتے۔

تاویل نمبر (۲)

بَلْ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ وَهُوَ حُجَّۃُ اَهْلِ السُّنَّۃِ وَالْجَمَاعَۃِ عَلٰی جَوَازِ رُؤْیَۃِ اللّٰہِ تَعَالٰی [1]

بلکہ حضرت موسٰے علیہ السلام نے کہا کہ مجھے اپنا آپ دکھلا کہ میں تیری طرف دیکھ سکوں۔" یہ بات اہل السنۃ والجماعۃ کے لئے رؤیت اللہ تعالٰے کے جواز پر حجت ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت موسٰے علیہ السلام کا اللہ کے دیدار کا سوال کرنا تمام حدوں سمیت پورا پورا دیکھ لینا، یعنی اس کا احاطہ کر لینا اور عدم احاطہ سے عدم رؤیت لازم نہیں آتی جیسا کہ علم کو احاطہ نہ کر لینے سے عدم علم لازم نہیں آتا مگر جائز ہے کہ رؤیت ہو مگر احاطہ کے ساتھ نہ ہو جس کی آیت میں نفی کی گئی ہے۔" (ریاض السالکین، ص ۷۰)

اب دیکھئے کہ:

۱ حضرت موسٰے علیہ السلام کے سوال دیدار الٰہی کو تو آپ اہل السنۃ والجماعۃ کے لئے دیدار الٰہی کے جواز پر حجت تبلا رہے ہیں لیکن اللہ تعالٰے کے انکارِ رؤیتِ الٰہی کا ذکر تک نہیں فرماتے۔ کیا حضرت موسٰے علیہ السلام کا سوال ہمارے لئے حجت ہے یا اللہ تعالٰے کا تردیدی جواب؟

۲ پھر عرشی صاحب ریاض السالکین نے حضرت موسٰی علیہ السلام کے دیدار الٰہی کے سوال کے ساتھ جو "تمام حدوں سمیت پورا پورا دیکھ لینا یعنی اس کا احاطہ کر لینا" کے اپنی طرف سے اضافے فرماتے ہیں، کیا آیتِ مذکورہ میں ایسی پابندیوں کی کہیں گنجائش نظر آتی ہے؟

۳ نیز عرشی صاحب کا طرزِ استدلال بھی ملاحظہ فرمائیے کہ: "علم کو احاطہ نہ کر سکنے سے عدمِ علم لازم نہیں آتا" یعنی اگر آپ کسی بات کے عالم نہیں، تو ضروری نہیں کہ وہ بات ہی نہ ہو اور اس کا علم ہی نہ ہو جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر حضرت موسٰی علیہ السلام اللہ کو نہیں دیکھ سکتے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی دوسرا بھی نہ دیکھ سکے۔ ہم تو ایسے خیال کو بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ صوفیاء کے ہاں اگر یہ درست ہو تو بھی ایسے نظریات انہی کو مبارک ہوں۔

حدیثِ قدسی سے دیدارِ الٰہی کا ثبوت

یہی عرشی صاحب اپنی کتاب ریاض السالکین کے صفحہ ۲۴۴ پر مشکوٰۃ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

حضرت ابی قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

مَنْ رَاٰنِیْ فَقَدْ رَاَی الْحَقَّ (مشکوٰۃ، ص ۳۹۴) جس نے مجھ کو دیکھا، اس نے خدا کو دیکھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ جب میں نے یہ پڑھا، تو دم بخود ہو گیا اور خیال آیا کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ خود تو درکنار، تمام صحابہ نے بھی اللہ تعالٰی کا دیدار کیا تھا۔ بہر حال مشکوٰۃ میں محولہ بالا روایت

---

[1] ان عبارات میں عربی عبارات صاحب تفسیر روح البیان کی ہیں، ترجمہ ہماری طرف سے ہے اور تشریح صاحب ریاض السالکین کی طرف سے۔

دیکھی تو معلوم ہُوا کہ یہ روایت مشکوٰۃ میں "باب الرؤیا" میں مندرج ہے اور اس سے پہلے ایک متفق علیہ حدیث بھی اسی مضمون کی مندرج ہے اور وہ یہ ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِي صُورَتِي	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا، بیشک اس نے مجھے ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صُورت اختیار نہیں کر سکتا۔"
متفق علیہ (مشکوٰۃ، ص ۳۹۲)	(بخاری و مسلم)

اب اسی باب میں اگلی روایت وہ ہے، جو عرشی صاحب نے درج فرمائی ہے جس کا واضح مطلب تو یہ ہے کہ جس نے مجھے دیکھا اس نے فی الحقیقت مجھے ہی دیکھا۔ اب عرشی صاحب نے ایک تو یہ ذکر نہ کیا کہ یہ روایت خواب سے متعلق ہے۔ دوسرے "حق" "یعنی حقیقت، سچ یا سچائی" کے کرنے کے اس کا ترجمہ "خدا" کر کے دیدارِ الٰہی کو ثابت کر دکھایا۔ ان صوفیاء کی یہی وہ بے اعتدالیاں اور کارستانیاں ہیں جن کی وجہ سے محدثین ابتداء ہی سے ان سے بدگمان رہتے اور ان سے مروی روایت قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔

دراصل عرشی صاحب بھی مجبور ہیں کیونکہ ان کے بڑے بڑے بزرگ ایسا ہی کچھ لکھ گئے ہیں۔ چنانچہ اسی کتاب "ریاض السالکین" کے صفحہ ۱۷ پر لکھتے ہیں کہ: "تفسیر عرائس البیان میں (ص ۷، ۱، س ۱۰) شیخ روزبہان تعلبی شیرازی جو ایک بہت بڑے بزرگ، ولیٔ کامل اور عارف باللہ ہوتے ہیں، فرماتے ہیں کہ

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ. عُمْيٌ عَنْ رُؤْيَتِ أَنْوَارِ جَمَالِ الْحَقِّ فِي سِيمَاءِ الْأَوْلِيَاءِ	.... وہ لوگ اندھے ہیں، جو اولیاء اللہ کی پیشانی میں حق تعالےٰ کے جمال کے انوار نہیں دیکھتے۔

دیکھئے! عرشی صاحب نے صرف "عُمْیٌ" کا مطلب تبلایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے صُمٌّ کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ اولیاء اللہ کی بات نہیں سنتے اور بُکْمٌ کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ ایسے اولیاء اللہ کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے اور ان کی تصدیق نہیں کرتے اور فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ان اولیاء اللہ کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے... اور یہ صفات اللہ تعالےٰ نے چونکہ منافقین کی بیان فرمائی ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو اولیاء اللہ کی پیشانیاں دیکھنے سے دیدارِ حق یا مشاہدۂ انوارِ جمالِ حق نہیں ہوتا وہ سب منافق ہیں۔

اس کے بعد صاحب عرائس البیان لکھتے ہیں کہ:

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِرْآةُ الْحَقِّ	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کا آئینہ ہیں جلال اور جمال کیساتھ

يَتَجَلّٰى بِجَلَالِهٖ وَجَمَالِهٖ لِلْأُمَنَاءِ وَالصِّدِّيْقِيْنَ مِنْهُ يَرَوْنَ اللّٰهَ بِرُؤْيَتِهٖ لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ: مَنْ رَّاٰنِيْ فَقَدْ رَاَى الْحَقَّ" (تفسیر عرائس البیان ص۳۰ ج۱، ش)

امینوں اور صدیقوں کے لئے۔ اور وہ حضور ﷺ کو دیکھنے سے اللہ تعالٰے کو دیکھ لیتے ہیں۔ کیونکہ آپ نے فرمایا ہے کہ جس نے مجھ کو دیکھا، اس نے خدا کو دیکھا۔" (ریاض السالکین، ص ۱۱)

اسے کہتے ہیں "بنائے فاسد علی الفاسد" یعنی پہلے حدیث کے مفہوم میں فریب سے کام لیا اور یہ ثابت کیا کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا اُس نے خدا کو دیکھا۔ پھر اس غلط مفہوم کو اصل بنیاد قرار دے کر یہ ثابت کر دکھایا کہ اولیاء اللہ کو دیکھنے سے بھی دیدارِ حق نصیب ہو جاتا ہے۔ گویا طریقت کی دنیا میں یہ چیز اتنی ارزاں ہے کہ کسی بھی ولی کو دیکھنے سے مل جاتی ہے لیکن شریعت کی دنیا میں یہ اتنی مہنگی ہے کہ حضرت موسٰے کو التجا کے باوجود نہ مل سکی۔

۵۔ دیدارِ رسول اللہ

احادیثِ صحیحہ سے یہ تو ثابت ہے کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا اس نے واقعی آپ ہی کو دیکھا، کیونکہ شیطان آپ کا روپ نہیں دھار سکتا، لیکن علماء اس پر یہ شرط ضرور عائد کرتے ہیں کہ یہ خوشخبری صرف صحابہ کے لئے ہے جنہوں نے آپ کو دیکھا تھا اور شکل پہچانتے تھے، دوسروں کو شیطان خواب میں دھوکا بھی دے سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ یہ یقین دلا دے کہ میں فی الواقعہ (نعوذ باللہ) رسول اللہ ہوں جبکہ حقیقتاً ایسا نہ ہو۔ لیکن طریقت کی دنیا ہی الگ ہے۔ وہ صرف کتبِ احادیث میں مذکور حلیہ مبارک کی بنا پر ہی یقین کر لیتے ہیں حالانکہ کئی آدمیوں کا حلیہ ایسا ملتا جلتا ہوتا ہے کہ ان کا فرق واضح کرنا مشکل ہوتا ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا حلیہ مبارک بھی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ سے ملتا جلتا تھا۔ اسی بنا پر جنگِ اُحد کے دوران جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے، تو ابن قمیئہ نے مشہور کر دیا کہ (نعوذ باللہ) حضرت محمد ﷺ شہید ہو گئے۔ (سیرت ابن ہشام اردو، غزوہ احد، ص ۵۵)

یہ تو خیر خواب کی بات تھی، لیکن صوفیاء کرام تو حالتِ بیداری میں بکثرت آپ کی زیارت سے مشرف ہوتے رہتے ہیں اور اس کی بنیاد درج ذیل حدیث ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ رَّاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَسَيَرَانِیْ فِی الْيَقْظَةِ وَلَا يَتَمَثَّلُ الشَّيْطَانُ بِیْ (متفق علیہ) (مشکوٰۃ ۳۵۴)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو عنقریب وہ مجھے بیداری میں بھی دیکھ لے گا، کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ (بخاری، مسلم)

اس حدیث کی شرح میں علماء نے درج ذیل اقوال نقل کئے ہیں:

۱۔ یہ بیداری کی زیارت قیامت کو ہوگی، اس سے پہلے نہیں (حاشیہ نمبر، مشکوٰۃ، ص ۳۹۴)

۲۔ صحیح مسلم میں ان الفاظ کے بعد یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

أَوْ لَكَأَنَّمَا رَآنِي فِي — یعنی کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ ایسا ہے جیسا کہ

الْيَقَظَةِ — اس نے مجھے جاگتے میں دیکھا (یعنی راوی حدیث کہتا ہے کہ

(مسلم، کتاب الرویا، ج ۲، ص ۲۴۲) — مجھے یاد نہیں کہ رسول اللہ نے پہلے الفاظ کہے تھے یا دوسرے۔

امام نووی نے اس حدیث کی شرح میں تین اقوال نقل فرمائے ہیں:

(i) اس سے صرف آپ کے اہل عصر مراد ہیں، یعنی جو لوگ مکہ میں ہیں اور ہجرت کر کے مدینہ ابھی نہیں آئے۔ وہ ہجرت کر کے آکر آپ کو بیداری میں بھی دیکھیں گے۔

(ii) آپ کی یہ زیارت آخرت میں ہوگی۔

(iii) یہاں رؤیت سے مراد رؤیت خاصہ ہے یعنی قیامت میں اسے آپ کا قرب حاصل ہوگا اور آپ اس کی شفاعت کریں گے۔ (مسلم، حوالہ ایضاً)

۳۔ شارح بخاری احمد علی سہارنپوری محدث نے بھی یہی مندرجہ بالا تینوں اقوال اس کی شرح میں نقل فرمائے ہیں۔ (بخاری، کتاب التعبیر، ج ۲، ص ۱۰۳۵، حاشیہ ۱۳)

یہ ہے حدیث مذکورہ بالا کی وہ تشریح جو شارحین حدیث اور علمائے اُمت نے بیان فرمائی، لیکن صوفیاء اس کا بالکل الگ اور نرالا مطلب بیان فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جس کسی صوفی نے آپ کو خواب میں دیکھا وہ اپنی زندگی میں ہی آپ کو بیداری کی حالت میں بھی ضرور دیکھ لے گا۔ چنانچہ ان اولیاء اللہ کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی بزرگ بھی آپ کی زیارت سے بیسیوں مرتبہ مشرف ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم پیران پیر کا ایک مشہور واقعہ نقل کرتے ہیں، جو تذکروں کی اکثر کتابوں میں درج ہے:

"ایک دن آپ وعظ فرما رہے تھے۔ شیخ علی ابن الہیتی پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اُن کو نیند آگئی۔ پیران پیر نے حاضرین کو خاموش بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود منبر سے اُتر کر شیخ علی بن الہیتی کے سامنے مؤدب کھڑے ہو گئے۔ جب شیخ موصوف بیدار ہوئے، تو پیران پیر نے پوچھا، آپ کے پاس رسول پاک تشریف لائے، تو انہوں نے کیا کہا؟ شیخ نے جواب دیا: "آپ کی خدمت میں حاضری کی تاکید فرمائی۔" پیران پیر نے کہا "میں اس لئے مؤدب کھڑا ہو گیا تھا اور جو کچھ تم نے خواب میں دیکھا ہے وہ سب کچھ میں نے حالت

بیداری[1] میں دیکھا ہے۔" (نفحات الانس فارسی، صفحہ ۵۶۷۔ مدارج النبوت فارسی بحوالہ سیرت غوث، ص ۲۱۰)

اس واقعہ کو ہمیں خود غلط ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں تذکروں کے دوسرے اقتباسات سے اس واقعہ کا غلط ہونا ثابت ہو جاتا ہے مثلاً:

۱۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ:

"آپ کی مجلس شریف میں کل اولیاء اللہ اور انبیائے کرام جسمانی حیات کے ساتھ اور ارواح کے ساتھ تشریف فرما ہوتے تھے۔" (اخبار الاخیار مصنفہ شیخ عبدالحق، ص ۱۷۔ قلائد الجواہر، ص ۴۷۔ سفینۃ الاولیاء، ص ۶۴۔ بہجۃ الاسرار، ص ۴۴۔ بحوالہ سیرت غوث، ص ۷۴)

۲۔ یہ اشتباہ بھی نہ رہنا چاہیئے کہ شاید ان انبیائے کرام میں سے رسول اللہ مستثنیٰ ہیں۔ چنانچہ ابوسعید قیلوی فرماتے ہیں کہ:

"میں نے کئی مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو آپ کی مجلس مبارک میں رونق افروز ہوتے دیکھا۔" (بہجۃ الاسرار، ص ۹۵۔ قلائد الجواہر، ص ۴۷۔ بحوالہ سیرت غوث، ص ۷۵)

اب دیکھئے یہ تینوں اقتباسات، جو ایک ہی کتاب سیرت غوث الثقلین سے لیئے گئے ہیں ایک دوسرے کی تغلیط کر رہے ہیں۔ وہ اس طرح کہ:

۱۔ جب حضور اکرم ﷺ حالتِ خواب میں شیخ علی بن الہیتی کے پاس تشریف لائے تو آپ کی یہ تشریف آوری صرف پیرانِ پیر ہی پر کیوں ظاہر ہوئی، جبکہ دوسرے انبیاء کرام اور کل اولیاء بھی آپ کی مجلس میں موجود تھے کیا ان کی قلبی آنکھیں وا نہ تھیں؟

۲۔ رسول اکرم ﷺ تو اکثر پیرانِ پیر کی مجلسِ وعظ میں تشریف لایا کرتے تھے، تو آپ ان کی موجودگی میں وعظ کیسے فرمایا کرتے تھے؟ علی بن الہیتی کے پاس حالتِ خواب میں آمد پر آپ نے حاضرین کو خاموش بیٹھنے کی تاکید فرمائی اور خود بھی اس وقت تک مؤدب کھڑے رہے جب تک آپ واپس نہ چلے گئے، تو کیا دوسری مجالس میں آپ نے حضور اکرم ﷺ کے لئے یہ طریق ادب ختم کر دیا تھا؟ یا پھر وہ پہلا افسانہ بھی محض تراشیدہ ہے۔

۳۔ آپ کی مجالس میں رسول اللہ ﷺ اور دوسرے انبیاء کرام کس غرض سے تشریف لاتے تھے؟ کیا

---

[1] اور صاحبِ ریاض السالکین نے یہ واقعہ درج کرنے کے بعد یہ اضافہ بھی فرمایا ہے: "کہ اس وقت سات آدمی وجد میں آکر واصل بحق ہوئے۔" (ریاض السالکین، ص ۳۱۱)

وہ خود آپ کی مجلسِ وعظ سے مستفید ہونے کے لئے آتے تھے؟ اگر ایسا ہے تو یہ تو الٹے بانس بریلی کو جانے لگے۔ یا وہ انبیاء دوسرے لوگوں کو ترغیب دلانے کے لیے آتے تھے کہ دیکھو! جب ہم اللہ کے نبی ہو کر پیرانِ پیر کی مجلس وعظ میں آ گئے ہیں تو تم کیوں نہیں آتے؟

وفاتِ نبوی کے بعد حضور ﷺ کی زندگی کیسی ہے؟

وفات کے بعد اور یوم البعثت سے پہلے کے درمیانی عرصہ کی زندگی کے تو سب قائل ہیں اور اسے حقیقی زندگی نہیں بلکہ برزخی زندگی کہا جاتا ہے، لیکن صوفیاء کا دعوےٰ یہ ہے کہ رسول اللہ اور اسی طرح دوسرے اولیاء مرتے نہیں بلکہ عوام کی نظروں سے پسِ پردہ چلے جاتے ہیں۔ پھر وہ خواص جن کی قلبی آنکھیں وا ہوتی ہیں وہ انہیں دیکھتے اور ان سے فیوض و برکات حاصل کرتے رہتے ہیں، لیکن عوام انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ اس سلسلہ میں مولانا اللہ یار خان صاحب دلائل السلوک کا تو یہاں تک دعوےٰ ہے کہ وہ چھ ماہ کی تربیت کے بعد سالک کو دربارِ نبویؐ میں پہنچا کر آپ سے بیعت بھی کروا دیتے ہیں۔ (دلائل السلوک، ص ۶۶، ۶۷) اب سوال یہ ہے کہ کیا صحابہ کرام نے بھی کبھی ایسے کام کئے تھے؟ کیا ان کی قلبی آنکھیں وا نہ تھیں؟ کہ وفات النبی کے بعد اس دربارِ نبوی کو دیکھ سکتے اور تابعین کی بیعت کروا دیتے۔

اب یہ تو واضح ہے کہ علمائے حق ایسی باتوں کو کسی قیمت پر قبول نہیں کرتے اور ہمیشہ سے صوفیاء پر گرفت کرتے چلے آئے ہیں۔ اور صوفیاء کا طریقِ کار یہ ہوتا ہے کہ جب دلائلِ شرعیہ کے سامنے ان کی کچھ پیش نہیں جاتی، تو منکرین کو اپنے رنگ میں رنگ کر ان سے اقرار کروا لیتے ہیں۔ یعنی علمائے شریعت جب تک صوفیاء کے رنگ میں نہ رنگے جائیں، کبھی ایسی باتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ ایسا ہی ایک واقعہ علاؤ الدین عطار نقشبند (م ۸۰۲ھ) کے زمانہ میں پیش آیا۔ حکیم سید امین الدین صاحب صوفیائے نقشبند علاؤ الدین عطار کی کرامات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک دن بخارا میں علماء کے درمیان رؤیت باری تعالیٰ پر بڑا مباحثہ ہوا۔ جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچے تو سب نے بالاتفاق حضرت خواجہ (علاؤ الدین عطار) کو ثالث تسلیم کر لیا۔ آپ نے منکرینِ رؤیت سے کہا کہ تم تین دن خاموشی کے ساتھ باوضو ہمارے پاس بیٹھو۔ ہم تین دن کے بعد فیصلہ دیں گے۔ تیسرے روز ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ بے ہوش ہو کر لوٹنے لگے، جب ہوش آیا، تو کہنے لگے ہم رؤیتِ حق پر ایمان لے آئے۔ اور اس کے بعد ہمیشہ آپ کی صحبت میں رہے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۷۵)

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں :

۱۔ تیسرے دن خواجہ موصوف نے ان پر کوئی ایسا عمل یا توجہ کی تھی جس کی وجہ سے وہ علماء بے ہوش ہو کر لوٹنے لگے تھے اور ایسے عمل جوگیوں، سادھوؤں اور مسمریزم کرنے والوں سب کے پاس ہوتے ہیں اور ان کا شریعتِ اسلامیہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

۲۔ جب تک خواجہ موصوف نے علماء پر یہ کیفیت طاری نہیں کی، انہوں نے رؤیتِ حق کا اقرار نہیں کیا۔ البتہ اس کیفیت کے بعد اقرار کر لیا۔

۳۔ شریعت اور طریقت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر شریعت کا رنگ غالب ہو تو صوفیانہ نظریات کا انکار ناگزیر ہے اور صوفیانہ رنگ غالب ہو تو ایسی باتوں کا اقرار کر کے شریعت کو اس کے تابع بنانے کی کوشش کی جاتی اور تاویلات اور حیلوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ پھر بعض بے باک صوفیاء تو شریعت کو درخورِ اعتناء سمجھتے ہی نہیں۔

۶۔ ذکرِ الٰہی

اللہ کے ذکر کی قرآن میں بار بار تاکید آئی ہے۔ ذکر کے معنی اللہ تعالےٰ کو یاد کرنا بھی ہے۔ بذریعہ تسبیح و تہلیل وغیرہ اور یاد رکھنا بھی۔ یعنی دل میں ہر وقت اللہ تعالےٰ کا دھیان اور خیال رہے اور افضل الذکر 'لا الٰہ الا اللہ' ہے۔ ذکرِ اللہ اس گروہِ صوفیاء کا موضوعِ خاص ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں بھی ان حضرات نے بیسیوں قسم کے بدعیہ اذکار دریافت کر لئے ہیں۔ جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں :

اقسامِ ذکر

"ذکر لاہوتی، ذکر جبروتی، ذکر ملکوتی، ذکر ناسوتی، ذکر مکاشفہ، ذکر مشاہدہ، ذکر ثلاثی گنبدی، ذکر ثلاثی مجرد، ذکرِ آہ، ذکرِ روح، ذکر سر، ذکر اہارت، ذکر آور دبرد، ذکر ضرب راست، ذکر مدور حلق، ذکر ثلاثی مغربی بہ دروازہ، ذکر بیکدم جلسہ، ذکر قربان، ذکر حدادی، ذکر مقدس، ذکر بودلہ، ذکر معلّی، ذکرِ جبران، ذکر قلندریہ، ذکرِ ضیاء، ذکر نور، ذکر تجلّی، ذکر ذجاج، ذکر جلابی، اذکار طہور، ذکر پاس انفاس، ذکرِ خفی استیلائے عشقیہ۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے اذکار ہیں، جو بخوفِ طوالت درج نہیں کئے۔" (ریاض السالکین، ص ۳۴۲)

اب ہمارے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ ان تمام اذکار و اوراد کے طریق اور ان کے فوائد بیان کریں۔ تاہم نمونۃً

چند ایک حاضرِ خدمت ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ بزرگان کرام بیسیوں سال مجاہدات میں صرف کر کے کیا کچھ حاصل کرتے رہے ہیں۔

۱۔ ذکرِ قلندریہ اور اَرواحِ مقدسہ

چاہیئے کہ جلسہ معبودہ متعین کر کے ہر دو زانو کے درمیان یا حَسَن ناف پر یا حُسَینُ دائیں شانے پر یا فَاطِمَۃُ بائیں شانے پر یا عَلِیُّ کی ضرب لگائے اور یا مُحَمَّدُ کی ضرب اپنے وجود میں لگائے اور پھر از سرِ نو شروع کرے۔ اس ذکر کی مواظبت سے ان حضرات کی ارواحِ مقدسہ تشریف لائیں گی، اور امداد فرمائیں گی اور طالب کو مطلوب تک پہنچائیں گی۔" (ریاض السالکین، ص ۳۲۲)

۲. ذکرِ نور اور کشفِ قبور

اِس ذکر سے کشف الارواح ہوتا ہے۔ طریقہ اس کا یہ ہے کہ جلسہ معہودہ متعین کر کے دائیں طرف سُبُّوحٌ بائیں طرف قُدُّوسٌ سامنے کی طرف یا رُوح الروح آسمان کی طرف ربُّ المَلَائِکَۃ اور دِل پر الروح کی ضرب لگائے۔ اس ذکر سے اور بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ جو عمل کرنے سے خود روشن ہو جائیں گے۔ کشف۔ قبور حاصل ہوگا۔" (ایضاً)

۳۔ افضل الذکر کا صحیح مقام

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے ذکر کا طریق بھی ملاحظہ فرمایئے:

" درمیان ذکر کلمہ طیبہ بطریقِ جہر" اولاً باوضو، قبلہ رُو، دو زانو بیٹھ کر گیارہ مرتبہ سورۂ اخلاص بالتعوذ بالبسم اللہ پڑھ کر ختم بر رُوح پر فتوح حضرت غوث الاعظم کی خدمت میں بھیجے بعدہٗ آنکھیں بند کر کے اور مرشد کی صُورت کا دِل میں تصور کئے ہوئے ہزار بار کلمۂ پاک لا الٰہ الا اللہ جہر سے پڑھے۔ ہر تسبیح کے خاتمہ پر محمد رسول اللہ کہے بعد ہزار بار" اِلَّا اللہ" ہزار بار بعدہٗ ہزار بار" ہُو" پڑھے اور اثنائے ذکر میں کلمہ شریف کے معنیٰ کو ملحوظ رکھے۔ جب یہ ذکر ختم ہو تو متوجہ بقلب صنوبری ہو کر جو کہ بائیں پستان سے دو انگل نیچے ہے مراقبہ میں بیٹھے اور نہایت توجہ و حضورِ دِل کے ساتھ اپنی تمام ہمت کو اسم اللہ کی یاد میں مصروف کرے......" (ریاض السالکین، ص ۳۱۶)

دیکھا آپ نے کہ اس افضل اور مسنون ذکر میں بھی ان حضرات نے شرک و بدعات کو کس طرح داخل کر دیا ہے۔

کیا رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ذکر کے یہی طریق سکھلایا کرتے تھے؟

پھر ان حضرات نے کئی قسم کے دُرود، مثلاً درود تاج، لکھی، ہزارہ وغیرہ۔ کئی طرح کی نمازیں مثلاً صلوٰۃ غوثیہ، صلوٰۃ فاتح، صلوٰۃ خضر، صلوٰۃ الاسرار، صلوٰۃ التسبیح اور کئی قسم کے ختم شریف، شش قفل، ہفت،

ہیکل، چہل کاف اور اسمائے عظام وغیرہ دریافت کر رکھے ہیں۔ جن سے رجال الغیب سے استمداد کی جاتی اور استفادہ کیا جاتا ہے جن کے ذریعہ کبھی رُوحوں کو حاضر کرتے، کشف قبور حاصل کرتے اور مختلف بیماریوں کے لئے تعویذ اور دَم جھاڑ تیار کرتے، عورت اور مرد کے درمیان جدائی یا محبت ڈالتے اور اپنی ولایت کی دھاک بٹھاتے ہیں۔ ہمارے صوفیاء کرام میں سے بیشتر ولیوں کی ولایت اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ وہی پرانی کہانت اور ساحری تقدس کا رُوپ اوڑھ کر "ولایت" کی صُورت میں ہمارے سامنے جلوہ گر نظر آتی ہے۔ نقوش و عملیات نے قوم کو جس طرح "بے عمل" بنا دیا ہے، وہ مستزاد ہے۔

۷۔ محبتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ کی محبت ہر مسلمان کے دین اور ایمان کا جزو ہے جس کے بغیر نہ دین مکمل ہوتا ہے نہ ایمان۔

اللہ تعالےٰ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۲/۱۶۵) — اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔

پھر اس محبتِ الٰہی کا معیار یہ تبلایا گیا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۳/۱۳) — (اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا۔

گویا اتباعِ رسُول اور محبتِ الٰہی لازم و ملزوم ہیں جتنا زیادہ کوئی متبع سنت ہوگا اتنا ہی وہ اللہ سے محبت رکھنے والا ہوگا اور اللہ اس سے محبت رکھنے والا ہوگا۔

اب دیکھتے کہ رسُول اللہ کا اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ آپ رات کو سوتے بھی تھے اور جاگتے بھی تھے۔ نفلی روزے رکھتے بھی تھے اور چھوڑتے بھی تھے۔ لذاتِ دنیا سے متمتع ہوتے تھے۔ حلوہ آپ کی پسندیدہ اور مرغوب غذا تھی۔ عطر کا استعمال فرماتے تھے۔ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ مقدمات کے فیصلے کرتے تھے۔ جہاد میں شرکت فرماتے اور سپہ سالاری کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ آپ کی کئی بیویاں تھیں۔ ان سے اور اپنی اولاد سے محبت کرتے تھے۔

معاشرتی تعلقات کو بحسن و خوبی نبھاتے تھے۔ زکوٰۃ و صدقات وصُول فرماتے اور انہیں مستحقین میں تقسیم فرماتے تھے۔ غرضیکہ معاشرتی، سیاسی، معاشی اور گھریلو زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس میں آپ نے راہنمائی نہ فرمائی ہو۔

ان سب کاموں کے باوجود آپ اللہ سے سب سے زیادہ محبت رکھنے والے تھے اور آپ اللہ کے حبیب و محبوب تھے۔

اب صحابہ کرام کی طرف آیئے۔ صحابہ کرام اللہ سے محبت رکھنے والے تھے۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و اتباع کے ساتھ ان سے بھی محبت رکھتے تھے حتیٰ کہ آپ کی محبت ہی معیارِ ایمان قرار پایا۔ پھر صحابہ کرام اپنے بال بچوں سے بھی محبت کرتے تھے۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی محبت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اب کسی دوسرے سے محبت کی ہی نہیں جا سکتی۔ ہر ایک سے اس کے مقام اور احکام شرع کے مطابق محبت کرنا یا اس کے برعکس کسی سے بغض رکھنا بھی عین اللہ کی محبت کا تقاضا ہے۔

محبتِ الٰہی بھی اور چہار ترک بھی

لیکن ہمارے صوفیاء کے ہاں محبتِ الٰہی کا معیار بالکل جداگانہ ہے انہوں نے محبتِ الٰہی کا جو طریق اختیار کیا ہے وہ بالکل راہبانہ اور غیر شرعی قسم کا ہے، جو چہار ترک سے شروع ہوتا ہے۔ خواجہ شریف زندنی (ولادت ۴۹۲ھ) نے خواجہ عثمان ہارونی (ولادت ۵۲۶ھ) کو خلافت کے وقت کلاہِ چہار ترکی یعنی چار کلیوں والی ٹوپی پہنائی اور ارشاد فرمایا کہ اس سے چہار ترکوں کی طرف اشارہ ہے۔ (۱) ترکِ دنیا (۲) ترکِ آخرت بجز ذات حق سبحانہ و تعالےٰ۔ (۳) ترکِ خواب و نوم (۴) ترکِ ہوائے نفس۔ (تاریخ مشائخ چشت مولانا زکریا، ص ۱۶۳)

اب دیکھئے ان کے ہاں ترکِ دنیا سے مراد، معاشرتی زندگی کا بائیکاٹ اور ترکِ نکاح وغیرہ ہے۔ ترکِ آخرت سے مُراد یہ ہے کہ نہ دوزخ کے عذاب کی پرواہ نہ جنت کے حصول کی آرزو۔ ترکِ خواب و نوم سے مراد رات اور دن میں کسی وقت بھی نہ سونا۔ اور ترکِ ہوائے نفس سے صرف لذائذ نفس ہی مراد نہیں بلکہ یہ لوگ ضروریات نفس کو بھی ترک کر دیتے ہیں اب دیکھ لیجئے ان میں سے کون سی بات سنت کے مطابق ہے۔ نیز قرآن کے بیان کردہ معیار کے مطابق اللہ سے اُن کو کس قدر محبت ہو سکتی ہے اور اللہ کو ان سے کس قدر؟

یہ حضرات دراصل ایسے صدیوں پرانے راہبانہ طریقوں سے تجلیاتِ ندائے غیب، اور رجالُ الغیب کی آمد اور ان سے ہمکلام ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ بس یہی ان کی محبتِ الٰہی ہے۔ اس طرح کی محبتِ الٰہی کے اِس دنیا میں خواہاں اور اسی طرح کی محبتِ الٰہی کے عالمِ آخرت میں آرزو مند ہیں۔

ترکِ دنیا

ترکِ دنیا کا جواز بلکہ اس کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے مسجدِ نبوی میں درس گاہِ صفہ

اور اس میں قیام پذیر صحابہ کی زندگی سے استدلال کیا جاتا ہے کہ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم دنیا سے آزاد ہو کر وہاں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ یہ استدلال مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر درست نہیں :

۱۔ امت کے افضل ترین بزرگ اصحابِ صفہ سے باہر کے لوگ تھے۔ مثلاً چاروں خلفائے راشدین بالترتیب۔ علاوہ ازیں عشرہ مبشرہ میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا، جو اصحابِ صفہ کا رکن ہو۔ اسی ایک بات سے ترکِ دنیا کا اصل مقام سامنے آجاتا ہے کہ اسلام ایک معاشرتی دین ہے۔ رہبانیت کا دین نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے ترکِ دنیا کو ناجائز یا حرام قرار نہیں دیا۔

۲۔ اصحابِ صفہ کی تعداد بالعموم ستر (۷۰) رہا کرتی تھی۔ اگرچہ کسی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو بھی ہو گئے تھے جبکہ اس دور میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ گویا ترکِ دنیا کرنے والوں کی نسبت مسلمان معاشرہ میں ایک فی ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ایک ہزار میں نو سو ننانوے صحابی تو معاشرتی زندگی بسر کرتے تھے اور ہزارواں آدمی اصحابِ صفہ کا رکن تھا۔ اتنی ہی اس ترکِ دنیا کی گنجائش ہے۔ لیکن تصوف کی دنیا میں ترکِ دنیا اصل الاصول سمجھی جاتی ہے۔

۳۔ صفہ علمِ شریعت کی درس گاہ تھی جہاں سے معلم اور مبلغ دوسرے مقامات پر بھیجے جاتے تھے۔ نہ کہ فنِ تصوف و کرامات کی تربیت گاہ۔ جس میں شرعی علوم کو جب تک پہلے محو نہ کر دیا جائے۔ اس فن کی تحصیل ممکن نہیں ہو سکتی اصحابِ صفہ اور ترکِ دنیا کی درست اور واضح مثال وہ دینی مدارس ہیں جہاں طلبا ترکِ دنیا کر کے کئی کئی سال تک علومِ شرعیہ کی تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہیں۔ موجودہ اولیاء اللہ کی خانقاہوں کا بھلا اس صفہ سے کیا تعلق ؟

۸۔ صحبتِ بزرگاں

صحبت کا اثر ایک فطری بات ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اثر کو ایک مثال سے سمجھایا کہ "اگر تم کسی عطار کی دکان پر بیٹھے ہو تو اگر عطر خرید کر استعمال نہ بھی کرو گے تو جب تک اس دکان میں بیٹھے رہو گے اس کی عطر بیز فضا سے تمہارا دماغ معطر رہے گا اور اگر تم کسی لوہار کی دکان پر بیٹھو گے تو تم چاہو یا نہ چاہو کوئی شرارہ اڑ کر تمہارے کپڑوں کو جلا دے گا۔"

پھر اس صحبت کے اثر کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی امت کا بزرگ سے بزرگ شخص یا پیر قطب صحابہ کرامؓ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت میں رہے تھے لیکن

یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی شخص کے درجات کی بلندی کا انحصار محض صحبت پر نہیں ہوتا بلکہ کئی دوسرے عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں اس کی مثال یُوں سمجھیئے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں حضرات کی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصاحبت کی مُدت برابر ہے، لیکن افضل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ قرار پائے۔ وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دینی خدمات اور خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لئے خدمات، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ تھیں۔ تو معلوم ہوا کہ کسی شخص کے تزکیۂ نفس اور اس کے متقی بننے میں بہت سے عوامل کا عمل دخل ہوتا ہے جن میں سے ایک یہی صحبتِ صالحہ بھی ہے اور یہی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ مثال سے بھی واضح ہوتی ہے۔

لیکن اس طبقۂ صوفیاء نے اس "صحبتِ بزرگان" کی اہمیت کو اتنا بڑھایا کہ اتقا کے حصُول اور تزکیۂ نفس کے لئے اسی ایک عامل کو اصل الاصُول قرار دے دیا۔ اور کسی صُوفی شاعر نے انہی خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہے

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریا

پھر یہ شعر مساجد کے محراب و منبر پر جھُوم جھُوم کر اور سر تال سے یُوں پڑھا جانے لگا، گویا یہ کوئی قرآنی آیت یا اس کا ترجمہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر اس شعر کی کچھ حقیقت ہے، تو خواجہ اویس قرنی کی عبادت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، جنہیں ایک منٹ کی صحبت بھی نصیب نہ ہوئی اور اس کے باوجود آپؐ نے انہیں خیر التابعین قرار دیا تھا۔

بات دراصل یہ ہے کہ اس طبقہ نے اپنے اس دینِ طریقت کی اہمیت کو جتلانے کے لئے ہر بات میں افراط و تفریط اور مبالغہ آرائی اور غلُو سے کام لے کر کسی اچھی بات کو بھی خواہ مخواہ مشکوک بنا دیا ہے جبکہ شریعت ہر بات کو اس کے جائز مقام پر رکھتی ہے۔ شرعی نقطہ نگاہ سے صُحبتِ بزرگاں اتقاء کے حصُول کے لئے مستحسن اور منجملہ دیگر عوامل کے ایک عامل ہے جبکہ دینِ طریقت اسے اصل الاصُول کے طور پر پیش کرتا ہے۔

۹۔ معرفتِ الٰہی

گروہِ صوفیا میں معرفتِ الٰہی کا موضوع جس اہمیت کا حامل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ معرفت کا لفظ ان کے ہاں علم (جو بذریعہ وحی حاصل ہوتا ہے) سے بہت بلند درجہ رکھتا ہے۔ معرفتِ نفس و معرفتِ الٰہی کے لئے ان کے ہاں ایک مشہور وضعی حدیث بھی موجود ہے یعنی مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ اب دیکھئے مولانا اللہ یار خاں صاحب کتنی زبردست دلیل سے معرفت کی ضرورت قرآن کریم سے پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (اَیْ لِیَعْرِفُوْنَ)

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں، یعنی میری معرفت حاصل کریں۔

جب معرفتِ الٰہی حاصل ہو گئی تو مقصدِ تخلیق پورا ہو گیا۔ پس ایسے مقبولینِ خدا جو غایتِ تخلیق کا مصداق ہیں۔ ان سے دشمنی رکھنا کورِ باطنی کی دلیل ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۹۰)

اب دیکھئے مولانا موصوف نے پہلے "لِیَعْبُدُوْنَ" کے آگے بریکٹوں میں "اَیْ لِیَعْرِفُوْنَ" شامل کیا۔ گویا کہ یہ مترادف الفاظ ہیں۔ حالانکہ یہ الفاظ قطعاً مترادف نہیں ہیں۔ پھر ترجمہ میں بریکٹوں کے بغیر یہ لفظ شامل کئے۔ پھر تشریح میں عبادت کا لفظ ختم کر کے اس کی جگہ معرفتِ الٰہی لے آئے۔ اس طرح تخلیق جن وانس کا مقصد عبادتِ الٰہی کے بجائے معرفتِ الٰہی ثابت کر دکھایا۔ اسے کہتے ہیں ہتھیلی پر سرسوں جمانا۔ پھر اس سے معرفت رکھنے والے طبقہ کی شان بھی واضح ہو گئی کہ ان عارفین کے علاوہ عام عابدین کی عبادت بے کار ہے کیونکہ معرفت کے بغیر نری عبادت تخلیق کا مقصد پورا نہیں کرتی اور اس سے ضمنی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اس معروف طبقہ اولیاء اللہ سے دشمنی اللہ سے دشمنی ہے۔"

چنانچہ مولانا موصوف نے اس عنوان کے تحت یہ آیت درج فرما کر ایسے نادر مسائل کا استخراج فرمایا ہے۔

۱۰۔ الخلق عیال اللہ

عنوانِ بالا حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس کا مفہوم کئی دوسری حدیثوں سے بھی واضح ہو جاتا ہے مثلاً اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ اسی حدیث کا ترجمہ مولانا حالی نے ان الفاظ میں بیان کیا۔

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر   خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے علاوہ جانور بھی ہماری ہمدردی کے حقدار ہیں۔ جیسا کہ احادیثِ صحیحہ سے مروی ہے کہ ایک فاحشہ عورت صرف اس وجہ سے جنت میں چلی گئی کہ اس نے ایک ایسے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا، جو شدتِ پیاس کی وجہ سے مر رہا تھا۔ یا ایک عبادت گزار عورت محض اس وجہ سے دوزخ میں گئی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ کر بھوکوں مار دیا تھا۔

انسانی حقوق پھر اس انسانی رحم اور ہمدردی کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے جسے مسلمان کو کافروں کے لیے بھی اپنانا ضروری ہے، مثلاً یہ کہ:

۱ انسان کا خون بہر حال محترم ہے اور حق کے بغیر نہیں بہایا جا سکتا۔

۲ عورت، بوڑھے، بچے، بیمار اور زخمی پر کسی حالت میں دست درازی درست نہیں۔

۳ عورت کی عصمت بہر حال قابلِ احترام ہے۔ اسے کسی حالت میں بھی بے آبرو نہیں کیا جا سکتا۔

۴ بھوکا آدمی روٹی کا، ننگا آدمی کپڑے کا یا بیمار آدمی علاج یا تیمارداری کا مستحق ہے خواہ وہ دشمن کی قوم سے ہی کیوں نہ تعلق رکھتا ہو۔

ان چند امور کے بعد ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم کی معاشرتی زندگی بالکل جداگانہ نوعیت کی ہوتی ہے۔ باقی تمام تر معاملات میں مُسلم تو آپس میں ایک دوسرے کے ہمدرد اور خیر خواہ ہوتے ہیں، لیکن غیر مسلموں کے معاملہ میں وہ سخت گیر ہوتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۲۹/۴۸)	محمد ﷺ اللہ کے رسُول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں سخت مگر آپس میں رحمدل ہیں۔

اور یہی وہ اسوۂ حسنہ ہے، جو رسُول اللہ ﷺ نے اپنایا اور صحابہ نے آپ کی اتباع میں اس پر عمل پیرا ہو کر دکھایا تھا۔

الخلق عیال اللہ کا صوفیانہ مفہوم

لیکن ہمارے صوفیا، جو وحدتُ الوجود پر ایمان رکھتے ہیں اور وحدتُ الوجود کی عینک چڑھا کر اسلامی تعلیمات کا مطالعہ فرماتے ہیں، تو ان کے نزدیک الخلق عیال اللہ کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے، وہ اپنے ذکر و فکر اور عشقِ الٰہی کی منازل کی تکمیل میں مسلم اور غیر مسلم سب کو ایک سطح پر لے آتے ہیں اور مسلم و کافر میں کچھ امتیاز روا رکھنے کو تنگ نظری اور تعصب کا نام دیتے ہیں۔ جناب خلیق نظامی صاحب اپنی کتاب تاریخ مشائخ چشت میں اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

"نظریہ وحدت الوجود میں اعتقاد کا اثر عملی زندگی میں بڑا زبردست پڑتا ہے۔ اس پر اعتقاد رکھنے والے کا مطمع نظر بلند، ہمدردیاں وسیع اور مقاصد اعلیٰ ہوتے ہیں۔ وہ عملاً الخلق عیال اللہ کا قائل ہوتا ہے۔ وہ ہر نظریہ کو ہمدردانہ سمجھنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر میں حقیقت تو ایک ہی ہے۔ وحدت الوجود پر ایمان لانے کے بعد انسان میں تنگ نظری اور تعصب کا وجود تو رہتا ہی نہیں۔" (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۱۳)

اب دیکھئے قرآن جس کردار کو اَشِدَّآءُ علی الکفار کے الفاظ کے ساتھ مومنوں کی صفت بیان کرتا ہے۔ اسی بات کو وحدتُ الوجود پر ایمان رکھنے والے صوفی تنگ نظری اور تعصب قرار دیتے ہیں۔ یہ اسی نظریہ کا اثر ہے کہ ان اولیا اللہ نے جو خانقاہیں قائم کیں ان میں ہندو مسلم، سکھ عیسائی سب اکٹھے رہتے اور پیر کامل ان سب کی یکساں تربیت فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ یہی خلیق نظامی صاحب اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۱۹۰ پر ذرا وضاحت فرماتے ہیں کہ:

"اگر تاریخ کے اشاروں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سماجی نظام مشائخ چشت کی کوششوں کا مرہونِ منت تھا۔ انہوں نے ان علاقے میں بسنے والے مختلف الخیال اور مختلف المذاہب لوگوں میں اتحادِ عمل اور اتحادِ فکر پیدا

کیا اور ان منتشر طبقوں کو ایک ایسے رنگ میں رنگ دیا۔ جس نے ایک مضبوط معاشرہ کی شکل اختیار کرلی۔ ان بزرگوں کی خانقاہوں میں ہندو اور مسلمان سب ہی جمع ہوتے تھے۔ ان مشائخ نے ان اختلافات کے پردوں کو ہٹا کر ہم دلی اور ہم زبانی پیدا کی۔" (ایضاً، ص ۱۹۰)

اب تو غالباً آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ الخلق عیال اللہ کا صوفیانہ مفہوم کیا ہے اور اس میں وحدت الوجود کا عقیدہ کیا بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ پھر ان لوگوں کا یہ دعوےٰ بھی ہے کہ ان کی خانقاہیں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب صفہ کا نمونہ ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کسی کافر کو اصحاب صفہ میں شامل کر کے اس سے بھی ایسی ہم دلی اور ہم زبانی پیدا کی گئی تھی؟

اور ہم کئی ایسے واقعات درج کر چکے ہیں کہ ان اولیاء اللہ کے ہندو سکھ بھی مرید اور عقیدت مند ہوتے تھے اور مسلمانوں ہی کی طرح ان کے مزارات کی زیارت کر کے یکساں فیض حاصل کرتے رہے۔ پھر کئی "اولیاء اللہ" ایسے بھی ہیں کہ ان کی موت پر مسلمان بھی تجہیز و تکفین کے ایسے ہی دعویدار ہوتے تھے جیسے ہندو اور سکھ۔ مثلاً بھگت کبیر، گورانند، بابا نانک اور مادھولال وغیرہ۔ یہ تو خیر دورِ آخر کی اور ہندوستان کی بات ہے۔ صوفیاء کے جدِ امجد معروف کرخیؒ (م ۲۰۶ھ) کی وفات پر بھی ایسا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ چنانچہ صاحب خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں:

"جب وفات پائی تو یہود و نصاریٰ دعوےٰ کرنے لگے کہ شیخ ہمارے مذہب پر تھے۔ مسلمانوں نے تردید کی، نزاع بڑھی، خدام کہنے لگے کہ ہمارے شیخ کی وصیت تو یہ ہے کہ "جو ہمارا جنازہ زمین سے اٹھائے گا ہم اسی سے ہیں۔" اس پر یہود و نصاریٰ نے باری باری جنازہ اٹھانے کی کوشش کی مگر اٹھا نہ سکے۔ پھر مسلمان آئے۔ انہوں نے جنازہ اٹھایا اور جس جگہ شیخ نے وفات پائی تھی، وہیں دفن کیا۔ شیخ معروف تجرید و تفرید اور بے سروسامانی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ شیخ ہجویری لکھتے ہیں کہ شیخ معروف کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں۔ علوم میں قوم کے مقتداء اور امام ہیں۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۲۹)

اب سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ آخر معروفؒ کرخی میں وہ کیا صفات تھیں جن کی وجہ سے یہود و نصاریٰ بھی اُن کا ہم مذہب ہونے کا دعوےٰ کرنے لگے۔ کیا نعوذ باللہ کسی صحابی کی وفات پر بھی ایسا دعوےٰ ہوا تھا۔ یہ صوفیاء کا گروہ بھی عجیب متضاد نظریات کا شکار ہے۔ ایسے واقعات بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ وحدت الوجود کے فضائل و مناقب بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہجویری صاحب بھی معروف کرخی کے اسی وجہ سے مداح ہیں۔ پھر اس تصوف کو شریعت سے ماخوذ ثابت کرنے بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ اور الخلق عیال اللہ کی آڑ میں اپنے غیر شرعی اعمال

کا شرعی جواز بھی تلاش کر لیتے ہیں۔

۱۱- زُہد زُہد سے یہ حضرات ترکِ دنیا مراد لیتے ہیں یعنی دنیا سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر کے جنگلوں ویرانوں صحراؤں، دریا کے کناروں پر جا کر سال ہا سال چلّے کاٹتے پھرنا جس کا مقصد خرقِ عادت امور کا حصول اور وقوع پذیر ہونا ہے جبکہ اسلامی زُہد یہ ہے کہ یہ دنیا کی محبت دل میں جاگزیں نہ ہو۔ حصولِ دنیا یا کسبِ حلال کو تو اسلام نے صرف جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن قرار دیا ہے یہ حضرات اس معاملہ میں احکامِ نبویؐ کی صریح خلاف ورزی کرتے ہیں۔

۱۲- اخلاقیات مثلاً تقوٰے، اخلاص، صبر، توکل، قناعت وغیرہ وغیرہ۔ ان چیزوں سے جو کچھ یہ حضرات مراد لیتے ہیں اسے بھی ہم پہلے "اسرار و رموز" کے عنوان کے تحت بیان کر چکے ہیں اور ان پر امام ابنِ قیم کا تبصرہ بھی۔

صوفیائے کرام کا تفسیری انداز

اب ہم صوفیاء کی اُن کوششوں کا جائزہ لیں گے جو اُنہوں نے طریقت کو شریعت ہی سے ماخوذ ثابت کرنے کے سلسلہ میں کی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جب فقہ قرآن وسنّت سے ماخوذ ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں تو اسی طرح تصوف بھی قرآن وسنّت ہی سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ جن لوگوں نے ظاہری معانی اور اعمال وافعال میں اجتہاد کیا وہ فقہاء کہلائے اور جن بزرگوں نے باطنی معانی اور اعمال وافعال میں اجتہاد کیا، وہ صوفی کہلائے۔ حقیقتاً دونوں گروہوں کا ماخذ قرآن وسنّت ہی ہیں ہم صوفیہ کے اس دعوٰی کے مطابق ان کے اجتہاد و استنباط کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

یہ تو ہم پہلے تبلا چکے ہیں کہ صوفیاء کے بنیادی نظریہ وحدت الوجود کی رُو سے مظاہر پرستی جائز قرار پاتی ہے لیکن قرآن اسے صریح شرک تبلاتا ہے۔ اب صوفیاء کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس نظریہ کو اسلام کے بنیادی کلمہ لاالٰہ الااللہ ہی سے ثابت کر دکھایا ہے۔ وہ اس کا ترجمہ یُوں کرتے ہیں لَا اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ اللہُ۔ نہیں کوئی معبود مگر وہ اللہ ہی تو ہے یعنی جس چیز کی بھی عبادت کی جائے وہ اللہ ہی ہوتا ہے۔

امام غزالی نے خواص کی توحید یُوں بیان کی تھی کہ لا ہُوَ الاّ ہُو۔ وہ نہیں مگر وہی۔

اور عام صوفیاء لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کی تفسیر بھی یُوں کرتے ہیں لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا ھو۔ گویا اِلٰہ کا ترجمہ مَوْجُوْد کر کے نظریہ

وحدت الوجود کو ثابت کر دکھلاتے ہیں۔

۲۔ اسی طرح آیت وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ (۲۳/۱۷) کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے "اور تیرے رب نے فیصلہ کردیا ہے کہ تم نہ عبادت کرو گے مگر وہ اسی کی ہوگی۔ یعنی جس چیز کی بھی عبادت کرو گے وہ اللہ کی عبادت ہی متصور ہوگی۔ یہ ترجمہ ایاك نعبد کے صریحاً خلاف ہے۔

۳۔ اسی طرح ایک آیت ہے فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (۱۱۵/۲) یعنی جدھر تم رُخ کرو ادھر ہی خدا کی ذات ہے۔ اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔ "تم جس چیز کی طرف بھی منہ کر کے اس کی عبادت کرو گے اس طرف اللہ ہی کا منہ ہوگا، چنانچہ خواجہ حسن سنجری کا یہ شعر انہی معانی کو بیان کر رہا ہے ؎

کافراں سجدہ کہ بروئے بتاں می کردند ہمہ رُو سوئے تو بود و ہمہ سُو روئے تو بود

ترجمہ: کافر جو بتوں کو سجدہ کرتے ہیں تو ان سب کا منہ تیری ہی طرف ہوتا ہے کیونکہ ہر طرف تیرا ہی چہرہ ہے۔

مندرجہ بالا آیات کی تشریح تو صرف نظریہ وحدت الوجود سے تعلق رکھتی ہے اور ان کا ذکر ہم اس عنوان میں پہلے کر بھی چکے ہیں۔ اب ہم ایسی مثالیں دیں گے جن سے علی الاطلاق دینِ طریقت کے نظریات اور اعمال و افعال کو ثابت کیا جاتا ہے۔

۱۔ نبہانی کا تفسیری انداز

نبہانی صاحب ایک عالم دین شخصیت ہیں۔ دیکھئے وہ کس طرح درج ذیل آیت کی تشریح کر کے اس سے دینِ طریقت کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ — بر وہ فعل جمیل ہے جس سے دل صاف اور نفس ذبح ہو اور تم ایسے افعال نہیں کرتے ہو جس سے تم تجلی افعال کے مقام سے ترقی کر کے ترقی صفات تک پہنچ جاؤ۔

وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ — اور تم اپنی فطرت کی کتاب پڑھتے ہو جو تم کو ایسے دین کا حکم کرتی ہے جس سے تم توحید کی راہ کے مالک بن جاؤ۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ — تم اپنی آزاد صفاتِ ذمیمہ کو انوارِ قدیمہ کے فیضان کی رسی سے باندھتے ہو جس کو حقیقی قدرت حاصل ہے۔ تم اسی سے مدد مانگو۔

بِالصَّبْرِ — اس سلوک پر صبر کے ساتھ جو تمہارے لئے روا رکھا جاتا ہے۔ تاکہ تم مقام رضا تک پہنچ سکو

وَالصَّلٰوةِ — اس سے مراد مراقبہ اور حضورِ قلب ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کو حاصل کیا جا سکے اور مراقبہ گراں ہے سوائے اُن لوگوں کے جن کے دلوں میں انکساری اور نرمی موجود

ہے تاکہ تجلیاتِ رب کو اور اس زبردست سطوت کے غلبے کو قبول کر سکیں یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے حضور میں ہونے کا یقین رکھتے ہیں اور یہی اپنی صفات کو اس کی صفات میں فنا اور گم کر کے اس کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ وہ بادشاہ باریک بیں اور زبردست کی شان و صفات کے علاوہ اور محسوس نہیں کرتے

یہ اتا مرون الناس بالبرّ سے لے کر انھم الیہ راجعون (۲/۴۴) کی تفسیر ہے (غایۃ الامانی فی الرد علی النبہانی ترجمہ اردو ۱۱۲/۲)

غور فرمائیے! علامہ نبہانی صاحب نے کس طرح صرف ایک آیت کی تشریح سے تصوف کے کتنے اہم مسائل مثلاً مراقبہ، نفس کشی، تجلیاتِ الٰہی، مقامِ رضا اور مقامِ فنا تک کو قرآن سے ثابت کر دکھایا ہے۔ جب آپ کی ایسی تشریح رسائل میں چھپنا شروع ہوئی تو غالی صوفیاء کے دلوں کو ٹھنڈا کر دیا۔

اسی طرح کے ایک اور علامہ عبدالغنی نابلسی ہیں۔ ان کا ملکۂ اجتہاد و استنباط بھی ملاحظہ فرمائیے:

۲۔ شیخ عبدالغنی نابلسی (م ۱۱۴۳ھ) کا تفسیری انداز

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۰/۷) یہ لوگ تو دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں۔

نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "جو شخص ظاہری امور میں مشغولیت اختیار کرتا ہے لیکن اس کے حقائق اور باطنی علم سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ وہ انسان غافل لادین، اسلام سے اُس کا کچھ لگاؤ نہیں۔ حالانکہ مقصود علمِ باطنی ہے اور اسی پر نجات کا دار و مدار ہے۔"

اس آیت میں آخرت کا معنی باطنی علم کر کے ان علوم کا قرآن سے ثبوت مہیا کیا گیا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے: "جو شخص کفر اور فسق کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے وہ زندیق ہے اور جو ہر چیز کی نسبت خدا کی طرف کرے وہ صدیق ہے۔" اور ثبوت میں یہ آیت پیش کی ہے:

مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷/۳) تو اللہ کی مخلوق میں کچھ فرق نہ پائے گا۔

نابلسی نے اس آیت کے سیاق اور سباق دونوں سے صرف نظر کر کے یہ مطلب نکال لیا۔ حالانکہ اس آیت میں سات آسمانوں اور نظامِ کائنات کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ تفسیر صوفیوں کے نظریہ "جبر" کا ثبوت پیش کر رہی ہے جو وحدت الوجود کے عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے۔

پس یہ ہے وہ طریقِ اجتہاد و استنباط، جس کے ذریعے طریقت کو شریعت سے ہی اخذ کیا جا رہا ہے۔ باطنی

علوم کے لئے آخر طریقۂ استنباط بھی باطنی قسم کا ہی ہونا چاہیئے۔

یہی وہ بات ہے جس کا اعتراف مولوی فضل میراں مترجم "انسانِ کامل" نے اس کے مقدمہ میں کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "شرعی علوم بطریقِ اعتبار واشارہ ان (باطنی علوم کی) کی تائید کرتے ہیں نہ کہ بطریقِ تفسیر و فحوائے کلام اور یہ شرعی علوم کمالاتِ نبوت کی ایک اعجازی صفت ہے۔ ورنہ شریعت کی راہ اور ہے اور ان صوفیوں کی راہ اور ہے" (انسان کامل، ص ۹)

اب دیکھئے! فضل میراں چونکہ خود بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان باطنی علوم کی طرفداری ان کے طبعی میلان کا تقاضا تھا، جو اُنہوں نے یہ لکھ دیا کہ شرعی علوم بطورِ اعتبار و اشارہ ان باطنی علوم کی تائید کرتے ہیں اور یہ شرعی علوم و کمالات کی ایک اعجازی صفت ہے۔" اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ واضح نصوصِ شرعیہ موجود ہوں وہاں اعتبار واشارہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا یہی ضرورت ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان باطنی علوم کو جو صریح شرک و بدعت کا مرقع ہیں، کا تعلق نصوصِ شرعیہ سے جوڑا جا سکے۔ خواہ یہ تعلق اشارہ کنایہ، اسرار و رموز ہی کے ذریعہ ہو!

۴۔ عبدالکریم جیلی کا تفسیری انداز

سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا آغاز فرما رہے ہیں۔

"جان کہ فاتحۃ الکتاب کا نام سبع مثانی ہے اور وہ سات صفات نفسیہ ہیں کہ وہ حیات، علم، ارادت، قدرت، سمع، بصر، کلام ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان تقسیم کیا ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وجود خلق اور حق پر منقسم ہے پس انسان باعتبار اپنے ظاہر کے خلق اور باعتبار اپنے باطن کے حق ہے .... عبد اور رب کے مابین اس کا انقسام اس اَمر کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اگرچہ خلق ہے پر حق اُس کی حقیقت ہے۔ پھر جیسا کہ وہ اوصافِ عبودیت کو حاوی ہے ایسا ہی اوصافِ ربوبیت کو بھی حاوی ہے۔ اس لئے کہ اللہ اس کی حقیقت ہے .... پس وہ یعنی عبد فاتحۃ الکتاب ہے اور وہ سبع مثانی ہے اور اس میں بہت سے اسرار ہیں جن کی ان اوراق میں گنجائش نہیں۔" (انسان کامل، ص ۲۱۴)

اب بسم اللہ اور الحمد سے وحدتُ الوجود کا ثبوت ملاحظہ فرمایئے:

"پھر جب بحرِ توحید میں قلب کا ملاح اسم کی کشتی پر سوار ہو گیا اور رحمانیت کی ہوا اِنِّیْ لَاَجِدُ نَفَسَ الرَّحْمٰنِ مِنْ جَانِبِ الْیَمَنِ کی جو ہیں چلنے لگی۔ معنی اس حدیث کے یہ ہیں کہ میں یمن کی جانب سے رحمٰن کی ریح طیبہ

کو محسوس کر رہا ہوں۔ یعنی نفس اسم رحیم کی رحمت کی ہدایت سے ذات کے کنارے تک پہنچ گیا۔ پھر وہ (بندہ) اپنے ذات و صفات میں منزّہ ہوا اور وجود کی فاتحہ کو کھولا اور ثابت ہوگیا کہ عابد عین معبود ہے۔ پھر کہا الحمد للہ۔ اللہ کے نفس کی ثنا۔ کی ساتھ اس چیز کے جس کا وہ مستحق ہے اور اس کے نفس کی ثنا، عین اس کا ظہور ہے اور اس چیز میں اس کی تجلی ہے۔" (انسان کامل، ص ۲۱۵)

اب لفظ "حق" سے وحدت الوجود کے اثبات کے دلائل بھی ملاحظہ فرمائیے:

"فرمایا اللہ تعالٰی نے وَمَا خلقنا السمٰوٰتِ والارض ومَا بینهما اِلّا بالحق۔ آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے ہم نے حق سے ان کو پیدا کیا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ ہر چیز حق سے پیدا ہوئی اور حق مادہٴ عالم ہے۔ اس کی مثال پانی و برف کی سی ہے، جس (یعنی مخلوق، مؤلف) میں حق مثل پانی ہے، جو برف کی اصل ہے اور عالم مثل برف کے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بستہ چیز پر برف کا نام عاریۃً ہے اور پانی کا حقیقتاً۔" (انسان کامل ص۸۴)

اس آیت میں بالحق کا ترجمہ مِنَ الحق کرکے جیلی صاحب نے اپنے فلسفہ کی بنیاد استوار فرمائی ہے۔

یہ تو تھی وحدت الوجود کے اثبات کے متعلق قرآنی دلیل۔ اب مصنف صاحب کے عقلی دلائل بھی ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ "جان کہ خیال جب ذہن میں کوئی صورت بناتا ہے، تو وہ صورت مخلوق ہے، جس میں خالق موجود ہے یعنی یہ تخیل و تشکل تجھ میں موجود ہے اور تو اس کا خالق ہے۔ اس مثال سے ظاہر ہے کہ تو حق ہے۔ اس اعتبار سے کہ حق کا وجود تجھ میں ہے۔ پس تیری تصویر حق میں واجب ہوئی اور حق اس میں پایا گیا۔ اس باب میں ایک جلیل القدر راز پر ہم نے تجھے آگاہ کیا۔" (انسان کامل، ص ۸۵)

۲۔ کیا تو اس اعتبار سے اپنے آپ کو نہیں دیکھتا کہ حق سبحانہٗ و تعالٰے تیرا عین اور تیری ہویت ہے۔ حالانکہ تو اپنی حقیقت سے، جس کا تو زیادہ حقدار ہے، غافل ہے۔ پھر اس اعتبار سے تو اپنے آپ سے عماء (اندھیرے) میں ہے اور تو بہ حیثیت اپنے حق کے اپنے آپ سے پوشیدہ نہیں ہوا۔" (انسان کامل، ص ۹۲)

۳۔ یا ہم دونوں مثل اس شخص کے ہیں جس کے دو نام ہیں اور ذات ایک ہے۔ جس نام سے ذات کو پکارا جاتا ہے وہ نام اسی کو پہنچتا ہے۔ میری ذات، اس کی ذات ہے اور میرا نام، اس کا نام ہے۔ اس سے اتحاد میں میرا نام عجیب و غریب ہے۔ علی التحقیق ہم دو ذاتیں نہیں ہیں کہ دونوں مل کر ایک ہوگئی ہوں، بلکہ خود نفس محب ہی حبیب ہے۔" (انسان کامل، ص ۱۰۵)

بتلایئے کیا سمجھے آپ؟ اگر مصنف کے اتنے عقلی اور نقلی دلائل کے باوجود بھی آپ نہ سمجھیں، تو مصنف

پیچارے کا کیا قصور ؟

۴۔ صوفیاء کے شیخِ اکبر ابن العربی کا تفسیری انداز

شیخِ اکبر نظریۂ حلول کو قرآن سے ثابت فرما رہے ہیں اور حروفِ مقطعات کی تفسیر کرتے ہوئے رسُول اللہ ﷺ کو اللہ کا اوتار بتلاتے ہیں ، چند حروفِ مقطعات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ حٰمٓ اَیْ حَقٌّ الْمُحْتَجِبُ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَھُوَ حَقٌّ بِالْحَقِیْقَۃِ مُحَمَّدٌ بِالْخَلِیْقَۃِ

حٰمٓ ۔ یعنی حق تعالٰے ، محمد ﷺ میں چھپا ہوا ہے ۔ پس آپ حقیقت میں حق ہیں اور خلیقت میں محمد (ﷺ) ہیں ۔ (تفسیر ابن عربی ، ج ۲ ، ص ۹۸ ، (المومن) بحوالہ ریاض السالکین ، ص ۵)

ایک دوسرے مقام پر انہی حرُوف کی تفسیر ذرا آسان الفاظ میں یوں بیان فرمائی :

۲۔ حٰمٓ ۔ ظُھُوْرُ الْحَقِّ بِالصُّوْرَۃِ الْمُحَمَّدِیَّۃِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

حٰمٓ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالےٰ کا ظہور صورتِ محمدی ﷺ میں ہے ۔ (ایضاً ، ص ۱۰۲ ، سطر ۱۷ ، بحوالہ ریاض السالکین ، ص ۶)

اور اگر حٰمٓ کے ساتھ عٓسٓقٓ بھی شامل ہو تو اس کی تفسیر یوں ہے :

۳۔ حٰمٓ عٓسٓقٓ ۔ اَیْ حَقٌّ ظَھَرَ بِمُحَمَّدٍ ظُھُوْرِ عِلْمِہٖ بِسَلَامَۃِ قَلْبٍ فَالْحَقُّ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ظَاھِرًا وَّ بَاطِنًا

حق اللہ ، محمد ﷺ کے ساتھ ظاہر ہُوا ۔ جیسا علمِ الٰہی کا ظہور سلامتی قلب کے ساتھ ہے ۔ پس حق تعالیٰ ظاہر اور باطن میں محمد ﷺ ہیں ۔ (ایضاً ، ص ۱۰۷ ، سطر ۹ ، بحوالہ ریاض السالکین ، ص ۵)

یعنی اگر صرف حٰمٓ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رسُول اللہ ﷺ ظاہر میں محمد ﷺ اور باطن میں حق تعالےٰ ہیں اور اگر حٰمٓ کے ساتھ عٓسٓقٓ بھی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ محمد ﷺ ظاہر میں بھی حق تعالےٰ ہیں اور باطن میں بھی ۔ یا حق تعالےٰ ظاہر میں بھی محمد ہے اور باطن میں بھی ۔

۴۔ قٓ ۔ اِشَارَۃٌ اِلَی الْقَلْبِ المحمدی الذی ھُوَ العرش الْاِلٰھِیُّ المحیط بِالْکُلِّ

قٓ سے قلبِ محمدی ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور وہ عرشِ الٰہی ہے ، جو کہ ہر شے کو محیط ہے ۔ (ایضاً ج ۲ ، ص ۲۰۱ ، سطر ۱۱ ، بحوالہ ریاض السالکین ، ص ۶)

۵۔ مولانا اللہ یار خاں صاحب مصنف دلائل السلوک کا تفسیری انداز

آپ فرماتے ہیں:

تجلیاتِ الٰہی کا ثبوت

"ہر انسان کے سینے میں ایک ہی دل ہے اور وہی محل تجلیاتِ باری کے لیئے مخصوص ہے۔ اس لیئے باری تعالےٰ اس میں غیر کا قبضہ پسند نہیں فرماتا۔ جب قلب تجلیاتِ باری کا مسکن بن جاتا ہے تو تمام رذائل ذلیل ہوکر چلے جاتے ہیں اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً (دلائل السلوک، ص ۲۸)

اب دیکھئے مولانا موصوف نے اپنے دعوے کی تائید میں جو آیت پیش فرمائی ہے اس کا انطباق مشکل ہے اگر ملوک سے مراد تجلیاتِ الٰہی مراد ہوں اور قریہ سے مراد دِل ہو، تو تجلیاتِ الٰہی تو دِل کو سکون بخشتی ہیں، تہس نہس تو نہیں کرتیں، پھر بادشاہ اس بستی کے رہنے والے معزز حضرات کو ذلیل تو بنا دیتے ہیں مگر بستی سے نکال تو نہیں دیتے جبکہ تجلیات سے رذائل نکل جاتے ہیں اور جو پہلے ہی رذائل ہیں اُن کے ذلیل ہونے کا کیا سوال ؛ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دنیا دار حکمرانوں کا کردار بتلایا تھا۔ آپ نے اس سے تجلیاتِ الٰہی اور رذائل کا ذلیل ہوکر چلے جانا ثابت کر دکھایا ہے۔

معرفتِ الٰہی کا ثبوت

آپ فرماتے ہیں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ (ای لیعرفون) — میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں یعنی میری معرفت حاصل کریں۔

جب معرفتِ الٰہی حاصل ہوگئی تو مقصدِ تخلیق پورا ہوگیا۔ پس اپنے مقبولینِ خدا، جو غایتِ تخلیق کا مصداق ہیں، ان سے دشمنی رکھنا کور باطنی کی دلیل ہے۔" (دلائل السلوک، ص ۹)

اس آیت کے ترجمہ اور تشریح میں جس طرح آپ نے تصرف فرمایا ہے وہ ظاہر ہے کہ پہلے 'لیعبدون' کا معنیٰ 'لیعرفون' لکھا۔ پھر تشریح میں 'لیعبدون' کو ختم کیا اور صرف 'لیعرفون' لا کر ثابت کر دکھایا کہ معرفتِ الٰہی ہی تخلیقِ انسانی کا اصل مقصد ہے۔ معرفت تو اس طرح ثابت ہوگئی، لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر زید یہ کہے کہ 'لیعبدون' کا معنیٰ لِیَجْھَدُوْنَ ہے، تو آپ اس کے دعوے کو کس دلیل سے باطل کر سکتے ہیں ؟

ہم نے معدودے چند نمونے پیش کر دیئے ہیں۔ ورنہ یہ سلسلہ بھی خاصا طویل ہے۔ آخر کس کس صوفی کی کون

کون سی تفسیر اس مختصر مضمون میں درج کی جا سکتی ہے۔ بالآخر یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ "ایں خانہ ھمہ آفتاب است"
سچ فرمایا تھا علامہ اقبالؒ نے کہ:

زمن بر صوفی و ملا سلامے — کہ پیغام خدا گفتند مارا،
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰؐ را

یعنی میں صوفی اور ملا کو سلام کہتا ہوں، جنہوں نے خدا کا پیغام ہم تک پہنچایا، مگر انہوں نے تاویل ایسی نرالی بنائی کہ خدا بھی، جبریل بھی اور حضورِ اکرم ﷺ بھی سر پیٹ کے رہ جائیں۔ (کہ ہم نے کیا کہا تھا اور ان لوگوں نے اس کا کیا مفہوم بنا لیا۔)

موضوعات اور غلط تاویلات کے سہارے

اگر مندرجہ بالا قسم کا تفسیری انداز اختیار کر لیا جائے تو احادیث کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسے مفسرین بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ تیسری صدی ھجری تک ایسی تفسیروں کا نہ رواج تھا اور نہ ہی ان کی ضرورت تھی۔ البتہ وہ دور ایسی موضوع احادیث اور رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے واقعات تراشنے کا ضرور تھا۔ ملا علی قاری (اپنی تصنیف) موضوعاتِ کبیر میں لکھتے ہیں کہ "روافض نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت کے فضائل و مناقب میں تین لاکھ روایات وضع کی تھیں۔" (اسلامی تصوف میں باطل نظریات کی آمیزش، از پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ص ۱۱۹، ۱۲۱) روافض کی طرح صوفیاء نے بھی اس میدان میں دل کھول کر حصہ لیا۔ صوفیاء کی امہات کتب میں سے اکثر چوتھی اور پانچویں صدی یا بعد میں تصنیف ہوئیں۔ جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

صوفیاء کی امہاتِ کتب

(۱) حسین بن منصور حلاج (م ۳۰۹) کی کتاب "الطواسین"
(۲) ابوالنصر سراج طوسی (م ۳۷۸) 〃 〃 "اللمع فی التصوف"
(۳) ابوبکر محمد کلاباذی (م ۳۸۰) کی کتاب "التعرف فی مذہب اھل التصوف"
(۴) ابوطالب مکی (م ۳۸۲) 〃 〃 "قوت القلوب"
(۵) ابوعبدالرحمٰن السلمی (م ۴۱۳) 〃 〃 "طبقات الصوفیاء"
(۶) ابوالحسن جھضمی (م ۴۱۴) 〃 〃 "بھجۃ الاسرار"
(۷) حافظ ابونعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) 〃 〃 "حلیۃ الاولیاء" (۱۰ جلد)

(۸) ابوالقاسم قشیری (م ۴۶۵ ھ) کی کتاب "رسالہ قشیریہ فی التصوف"
(۹) یخ علی ہجویری (م ۴۶۵/۴۸۰ ھ) " " "کشف المحجوب"
(۱۰) ابواسمٰعیل عبداللہ ہروی (م ۴۸۱ ھ) " " "منازل السائرین"
(۱۱) امام غزالی (م ۵۰۵ ھ) " " "احیاء العلوم" اور "کیمیائے سعادت"
(۱۲) یخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ ھ) " " "فتوح الغیب"
(۱۳) شہاب الدین سہروردی (م ۶۳۲ ھ) " " "عوارف المعارف"
(۱۴) عبدالکریم جیلی (م ۸۰۵ ھ) " " "الانسان الکامل"

پانچویں صدی کے بعد ان کتب میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ان تمام ترکتب میں ضعیف اور موضوع احادیث کی بھرمار ہے۔ حتّٰی کہ امام غزالی جیسے فضلاء نے بھی اپنی تصانیف میں ایسی احادیث کو درج کرنے کے سلسلہ میں تساہل سے کام لیا ہے۔ تاج الدین سبکی نے صرف "احیاء العلوم" کی بے بنیاد حدیثوں کو جمع کرکے ۷۴ صفحات پر مشتمل فہرست اپنی کتاب "الطبقات الشافعیہ" میں شامل کی ہے۔ (امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، کوکن عمری، ص ۲۵۰)

صوفیہ نے دینِ طریقت کو شریعت ہی سے ماخوذ کرنے کے لئے چار طرح کے اقدامات کئے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ قرآنی آیات کی غلط سلط تاویل و تعبیر، جس کا نمونہ ہم پیش کر چکے ہیں۔

۲۔ احادیثِ صحیحہ کی غلط تاویل و تعبیر، جو ضمناً اس کتاب میں اپنے اپنے مقام پر درج کی گئی ہیں۔

۳۔ موضوع احادیث، یعنی ایسے اقوال، جو رسول اللہ ﷺ کی طرف خواہ مخواہ منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ پھر ان کے ہاں بعض احادیث ایسی بھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ جسے عُرفِ عام میں حدیث قدسی کہتے ہیں۔

۴۔ موضوع واقعات، یعنی ایسے واقعات جنہیں خود تراش کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ سردست ہم صرف نمبر ۳ اور نمبر ۴ قسم کے موضوعات کا مختصراً تذکرہ کریں گے۔

موضوع احادیث

ان کا پورا شمار تو ہمارے موضوع سے خارج اور احاطہ سے باہر ہے۔ تاہم چند مشہور موضوع احادیث

کا تذکرہ مختصراً ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ ابتدائے کائنات سے متعلق

اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں:

كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَأَحْبَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ — میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، تو

فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (حدیث قدسی، دریاض السالکین، ص ۳) — مَیں نے خلقت کو پیدا کیا۔

اور ایک دوسری روایت میں "فَخَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ" کے الفاظ ہیں۔ ملاّ علی قاری نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔ (اسلامی تصوف میں باطل نظریات، ص ۱۱۹)

۲۔ نورِ محمدی

إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللهُ نُورُ نَبِيِّكَ يَا جَابِرُ — اے جابر! اللہ نے سب سے پہلے تیرے نبی (محمدؐ) کے نور کو پیدا کیا۔

اسی موضوع حدیث کو یُوں بھی روایت کیا گیا ہے:

إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللهُ نُورِي — رسُول اللہ نے فرمایا: بیشک پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ میرا نُور تھا۔

یہ حدیث یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر گھڑی گئی ہے۔ فلاسفہ جس چیز کو عقلِ دوم کہتے ہیں۔ صوفیاء اُسے ہی نورِ محمدی کہتے ہیں۔ اس حدیث اور اس فلسفہ پر تفصیلی بحث ص ۴۸۱، ۴۸۲ پر ملاحظہ فرمایئے۔

اب موضوع حدیث کی مزید تفسیر بھی ملاحظہ فرمائیے:

۳۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: "اے جابر! تحقیق اللہ تعالےٰ نے تمام اشیاء سے پہلے تیرے نبی کا نور پیدا کیا اپنے نور سے۔ پھر وہ نُور قدرتِ الٰہیہ سے، جہاں اللہ کو منظور ہوا سیر کرتا رہا اور اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم تھا اور نہ بہشت نہ دوزخ اور نہ فرشتے۔ نہ آسمان نہ زمین۔ نہ سورج نہ چاند نہ جن نہ انسان۔ پھر جب اللہ تعالےٰ نے مخلوق کو پیدا کرنا چاہا، تو اس نُور کے چار حصے کئے۔ حصہ اول کا قلم بنایا۔ حصہ دوم کی لوح، تیسرے حصے کا عرش، چوتھے سے کُل کائنات۔ (شرح قصیدہ ہمزیہ، ص ۱۵، بحوالہ ریاض السالکین ص ۲۴۵)

یہ حدیث سننے کے بعد ممکن ہے آپ کو یہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہو کہ اس نورِ نبی کو پیدا ہوئے کتنی مدت

گزری؛ تو لیجئے ایسی موضوع حدیث بھی حاضر خدمت ہے:

۴۔ "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے سوال کیا کہ تمہاری عمر کتنی ہے؟ تو حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کی کہ اے آقا! میں اچھی طرح عمر نہیں جانتا، مگر اتنا جانتا ہوں کہ چوتھے حجاب میں ستارہ تھا، جو ستر ہزار سال کے بعد طلوع ہوا کرتا تھا اور میں نے اس کو ۷۲۰۰۰ (بہتر ہزار مرتبہ دیکھا ہے۔" تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "مجھے پروردگار کے عزت و جلال کی قسم! وہ ستارہ میں ہی ہوں۔"

اب دیکھئے! کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنی عمر ۷۰۰۰۰ × ۷۲۰۰۰ = ۵۰۴۰۰۰۰۰۰۰ سال، ایک ارب چون کروڑ سال بتلائی ہے اور یہ ستارہ یعنی نور نبی اس سے بہرحال مدتوں پہلے کا تھا۔ یہ کتنا پہلے کا تھا؟ اس موضوع حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے نور کی عمر نہیں بتلائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس "حدیث تراش" کو اس سے زیادہ حساب آتا ہی نہ تھا۔

۵۔ یہ بھی یاد رہے کہ اس نور نبی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے چہرے کے نور سے پیدا کیا تھا اور اس بات کا اقرار اللہ تعالیٰ خود کرتے ہیں۔ چنانچہ روایت ہے:

قَالَ اللہ تعالیٰ: "خَلَقْتُ مُحَمَّدًا مِنْ نُوْرِ وَجْھِیْ۔" وَالْمُرَادُ مِنَ الْوَجْہِ ذَاتِ الْمُقَدَّسَۃِ۔ (سر الاسرار ص ۱۳، سطر ۸، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۹۰)	اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (یعنی یہ موضوع حدیث، حدیث قدسی ہے) میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چہرے کے نور سے پیدا کیا۔" اور چہرے سے مراد ذات مقدس باری تعالیٰ ہے

۶۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس موضوع حدیث قدسی کی تائید ایک اور موضوع حدیث سے فرما دی۔ اور وہ حدیث یوں ہے:

در حدیث قدسی وارد است:	حدیث قدسی میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
یَا مُحَمَّدُ! اَنْتَ اَنَا وَاَنَا اَنْتَ	"اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تو میں ہوں اور میں تو ہے"

جواہر غیبی، ص ۲۸۲، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۹۲)

۷۔ پھر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی یوں تائید فرماتے ہیں کہ "میں اللہ کے نور سے ہوں" اور اس کی مزید تشریح یوں بھی کرتے ہیں کہ "میں اللہ کے نور سے ہوں اور کل میرے نور سے ہیں۔" (مدارج النبوت ج ۲، ص ۶۰، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۲۴۹)

اب بات یوں ہوئی کہ اللہ نے سب سے پہلے نور نبی کو پیدا اور یہ نور نبی ایک ستارہ تھا جس سے حضرت جبریل

نے اپنی عمر کا حساب بتایا تھا۔ اب اس نورِ نبی یا ستارہ سے ہی عرش، لوح و قلم، کرسی، بہشت و دوزخ اور شمس و قمر پیدا کئے جا رہے ہیں۔ یعنی ایک ستارہ سے ہی پوری کائنات کی تخلیق بتلائی جا رہی ہے۔

۷۔ حضرت آدم علیہ السلام سے جب گناہ سرزد ہوا، تو یہی نورِ نبی اس گناہ کی مغفرت کا سبب بنا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :

"جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکال کر دنیا میں بھیجے گئے، تو سر وقت روتے اور استغفار کرتے تھے ایک مرتبہ آسمان کی طرف منہ کیا اور عرض کی : "اے باری تعالیٰ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے مغفرت چاہتا ہوں۔" وحی نازل ہوئی۔ "محمد کون ہیں؟" عرض کیا: "جب آپ نے مجھے پیدا کیا تھا، تو میں نے عرش پر لکھا ہوا دیکھا تھا کہ: "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" تو میں سمجھ گیا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اونچی کوئی ہستی نہیں ہے۔ جن کا نام تم نے اپنے نام کے ساتھ لکھ رکھا ہے۔" وحی نازل ہوئی کہ" وہ خاتم النبیین ہیں، تمہاری اولاد میں سے ہیں، لیکن وہ نہ ہوتے تو تم بھی پیدا نہ کئے جاتے۔" (ریاض السالکین ص ۲۰۲)

اب دیکھئے! اس موضوع حدیث میں یہ ذکر کہیں نہیں آیا کہ پھر حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ بھی قبول ہوئی یا نہیں الٹا اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر حضرت آدم علیہ السلام کو اور بھی مایوس کر دیا کہ اگر وہ نہ ہوتے تو تم بھی نہ ہوتے۔ کسی سائل کو اگر ایسا جواب دیا جائے تو بتلائیے کہ اس کے دل پر کیسی بیتتی ہے۔

البتہ اس حدیث نے اور کئی مسئلے حل کر دیئے۔ مثلاً (۱) خواہ کتنے ہی برس اللہ سے رو رو کر مغفرت چاہیں قبول نہیں ہوتی، جب تک کسی کا وسیلہ نہ پکڑیں اور (۲) یہ وسیلہ اپنے نیک اعمال کا نہیں، ایسی ہستی کا بھی ہو سکتا ہے جو ابھی تک وجود میں نہ آئی ہو۔

کاش! یہ بات حضرت آدم علیہ السلام کو اتنی مدت رونے سے پہلے ہی معلوم ہو جاتی۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت

تیسری بات یہ یاد رکھئے کہ یہ نورِ نبی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی چیز ہیں، کیونکہ ایک اور موضوع حدیثِ قدسی یوں بھی ہے

۹۔ عَنْ ابن عباس يقول الله : وَعِزَّتِي وَ جَلَالِي لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الدُّنْيَا۔ (ریاض السالکین، ص ۲۴۴)

ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اگر تم نہ ہوتے، تو میں دنیا کو پیدا ہی نہ کرتا۔"

۱۰۔ ایک دوسری روایت میں یہ موضوع حدیثِ قدسی یوں بھی آئی ہے :

لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ (ریاض السالکین ص ۱۹) "اگر تم نہ ہوتے، تو میں کائنات کی کوئی چیز بھی پیدا نہ کرتا۔"

۱۱۔ پھر چونکہ آپ اللہ کے نُور سے نُور تھے، لہٰذا آپ کا سایہ نہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا۔ آپ کبھی سورج کے ساتھ نہیں ہوئے مگر آپ کا نور پاک سورج کی روشنی پر غالب ہوتا۔" اور ابن سبع نے کہا: "جب سورج یا چاند میں چلتے تو آپ کا سایہ ظاہر نہ ہوتا، کیونکہ نور کا سایہ نہیں ہوتا۔" (زرقانی ۴/۲۲۰، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۳۴۸)

اب مشکل یہ ہے کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ "ہمارے گھر میں چراغ جلتا تھا اور آپ کا سایہ بھی ہوتا تھا۔" ہو سکتا ہے کہ سورج اور چاند کی روشنی میں ہی آپ کا نُور چمکتا ہو۔ رات کے اندھیرے میں نہ چمکتا ہو۔ پھر یہ چراغ کی روشنی میں آپ کے سایہ کی سمجھ نہیں آتی، حالانکہ یہ چراغ بھی تو آپ کے نور سے ہی پیدا ہوا تھا!

۱۲۔ پھر یہ اللہ کے نور سے نور ہی کا اثر تھا کہ آپ ہر جگہ حاضر و ناظر ہوتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ اس کی دلیل عرشی صاحب ریاض السالکین نے صفحہ ۲۴۴ پر اس قرآنی آیت سے دی ہے:

وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَہِیْدًا (۲/۱۴۳) "اور رسول تم پر گواہ یعنی حاضر و ناظر رہتے ہیں۔ جب رسول پاک ہر وقت گواہ رہتے ہیں، تو پھر اپنے ہر امتی کے اعمال سے باخبر ہیں کہ فلاں کے اعمال کیسے ہیں اور دین کس درجہ پر ہے۔" (ریاض السالکین، ص ۲۴۴)

حاضر و ناظر کی یہ دلیل تو خوب ہے لیکن مشکل یہ آپڑتی ہے کہ اس آیت کا پہلا حصہ یوں ہے کہ "لِتَکُوْنُوْا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ" پھر کیا تمام صحابہ بھی حاضر و ناظر ہیں، جو دوسرے لوگوں پر گواہ اور ان کے اعمال کے نگران ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر آپ کی خصوصیت کیا رہی؟

البتہ اس کھینچا تانی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر ثابت کرنے کا ایک فائدہ ضرور ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ تمام پیروں، فقیروں یعنی اولیاء اللہ کے حاضر و ناظر ہونے اور اپنے مریدوں کے اعمال پر نگران بنے رہنے کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔

۱۳۔ آپ کے اللہ کے نُور سے نُور ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ جس طرح اللہ کے لئے یا نوُر کے لیے موت نہیں، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دائمی زندگی ثابت کی جاتی ہے۔ آپ کا دربار بھی لگتا ہے۔ اس میں باقاعدہ بیعت بھی کرائی جاتی ہے۔ اولیاء آپ کے پاس اور آپ اولیاء کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں اور آپ نے وہ تمام امور بھی سنبھال رکھے ہیں جو اللہ کے ذمہ ہیں اور قیامت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرائض

بجالاتے رہیں گے اور یہ سب کچھ صحیح حدیث کے ایک ٹکڑے "اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ مُعْطِیْ" (میں تو صرف بانٹنے والا ہوں، عطا کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے) سے ثابت کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ الفاظ آپ نے اس وقت ادا فرمائے تھے جب آپ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے۔

ہمارے اولیاء اللہ نے اس تاویل سے بھی جی بھر کر فائدہ اٹھایا ہے۔

۴۔ قبر النبی ﷺ کی زیارت کے متعلق موضوعات

اسی عقیدہ کی بنا پر لوگوں نے آپ کی قبر کی زیارت کی فضیلت پر بہت سی حدیثیں تراشی ہیں، جن میں سے چار پانچ ہم قبروں کے بیان (باب ششم) میں ذکر کر آئے ہیں اور علماء نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ ایسی تمام احادیث جو قبر النبی ﷺ کی زیارت اور فضیلت سے تعلق رکھتی ہیں سب موضوع ہیں۔ البتہ صوفیاء کے لئے ایسی موضوعات بہت کارآمد ہیں کیونکہ یہ اُن کی قبوری شریعت کے لئے بنیاد فراہم کرتی ہیں اور پختہ قبروں اور مزاروں کی تعمیر، عرسوں، میلوں، مجاورت اور نذرانوں اور چڑھاووں کے لئے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

۵۔ اولیاء اللہ کی شان کے متعلق موضوعات

۱۵۔ اَوْلِیَائِیْ تَحْتَ قَبَائِیْ لَا یَعْرِفُھُمْ غَیْرِیْ (حدیث قدسی)	اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے اولیاء میری قبا میں ہیں جنہیں میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (تذکرہ غوثیہ، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۲۳۹)
۱۶۔ اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ تَلَامِیْذُ الرَّحْمٰنِ (حدیث قدسی)	بیشک اولیاء اللہ میرے شاگرد ہیں۔ (جمال، ص ۱۱۹، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۲۳۶)
۱۷۔ اَلشَّیْخُ فِیْ قَوْمِہٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِہٖ (ریاض السالکین، ص ۲۳۰)	نبی کریم ﷺ نے فرمایا: شیخ اپنے مریدوں میں ایسا ہوتا ہے، جیسے نبی اپنی امت میں۔

۶۔ معرفت کے متعلق احادیث موضوعہ

۱۸۔ معرفتِ نفس کے متعلق یہ حدیث "من عرف نفسہٗ فقد عرف ربّہٗ" بھی موضوع ہے۔ مجدد الف ثانیؒ نے اس کو موضوع تو نہیں سمجھا مگر اس کی تاویل کر کے اُسے صحیح رُخ کی طرف ضرور موڑ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: "ابن عربی نے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ، کی تاویل میں بھی غلطی کی ہے۔ یعنی اپنے نفس کی معرفت میں خدا کی

ل بایزید بسطامی اسی بناء پر سنتِ رسول ﷺ سے بے نیاز تھے، وہ کہتے تھے کہ ان راویوں سے احادیث بیان کرتے ہو، جو مر چکے ہیں جبکہ ہم اللہ سے براہ راست ہمکلام ہوتے ہیں، جو حیٌّ لایموت ہے۔

معرفت سمجھتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ عین یک دیگر ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی فطرت کے نقائص اور عیوب کو محسوس کر لیتا ہے، وہ پا لیتا ہے کہ فضائل اور کمالات صرف خدا کی ذات میں ہیں۔" (حضرت مجدد کا نظریہ توحید، بحوالہ مکتوب ربانی، دفتر ۲، مکتوب ۲۳۴)

حضرت مجدد کی یہ تاویل، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ سے البتہ مطابقت رکھتی ہے۔

۱۹۔ قَالَ عَلَیْہِ الصلوٰۃ والسلام : مَنْ عَرَفَنِیْ فَقَدْ عَرَفَ الْحَقَّ وَمَنْ رَاٰنِیْ فَقَدْ رَاَی الْحَقَّ۔ (تفسیر عرائس البیان ج ۱، سطر ۳، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جس نے مجھے پہچانا اس نے اپنے خدا کو پہچانا اور جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کو دیکھا۔

معلوم ہوا کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے بھی اپنے رب کو پہچان لیا اور جس نے رسول اکرم کو پہچان لیا اس نے بھی اپنے رب کو پہچان لیا۔ اب اس معرفتِ الٰہی کا فائدہ درج ذیل موضوع حدیث میں ملاحظہ فرمائیے۔

۲۰۔ مَنْ عَرَفَ اللہَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْئٌ (مرشد کامل، ص ۹)

جس نے اللہ کو پہچان لیا۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔

۷۔ دینِ طریقت اور باطنی علوم کی فضیلت

۲۱۔ الشریعۃ اَقْوَالِیْ، الطریقۃ افعالی والحقیقۃ حَالِیْ (مرشد کامل، ترجمہ حدائق الاخیار، ص ۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شریعت میرے اقوال، طریقت میرے افعال اور حقیقت میرا حال ہے۔

۲۲۔ حدیث شریف، اِنَّ لِلْقراٰنِ ظھرًا وَ بطنًا و لبطنہٖ بَطْنٌ اِلٰی سبعۃ ابطُنٍ وَفِی روایۃٍ اِلٰی سَبْعِیْنَ بَطْنًا۔ (ریاض السالکین، ص ۳۴۷)

بے شک قرآن مجید کا ایک ظاہری پہلو ہے اور ایک باطنی۔ پھر باطنی پہلو کا ایک اور باطنی پہلو ہے، جو سات پہلوؤں تک ہے۔ اور ایک دوسری روایت ہے کہ ستر باطنی پہلوؤں تک ہے۔

اب بتلائیے کہ جہاں باطنی پہلوؤں کی اتنی گنجائش ہو وہاں تصوف پر باطنیت کی چھاپ نہ ہو تو اور کیا ہو؟ پھر جب ہم یہی بات کہتے ہیں تو ان کرم فرماؤں کو یہ بات بھی بھلی نہیں لگتی۔

۸۔ سماع و وجد کے متعلق موضوعات:

۲۳۔ اَلسَّمَاعُ مُبَاحٌ لِاَھْلِہٖ (مرشد کامل ترجمہ حدائق الاخیار، ص ۱۵۰)

سماع اس کے اہل کے لئے مباح (جائز) ہے۔

اور وہ اہل کون ہے؟ یہ حدیث بھی حاضر ہے:-

۲۴- اَلسَّمَاعُ مُبَاحٌ لِمَنْ كَانَ قَلْبُهٗ حَيًّا عَنِ الدُّنْيَا مَيِّتًا (حوالہ ایضاً)

سماع اس شخص کے لئے جائز ہے۔ جس کا دل زندہ، لیکن دنیا کی طرف سے مُردہ ہو۔

۹- سماع موتیٰ سے متعلق موضوع حدیث :

۲۵- "حدیث شریف میں ہے کہ: کسی بھی قبر پر چڑیا یا چڑا بیٹھے تو صاحب قبر کو اتنا بھی معلوم ہوتا ہے کہ قبر پر مذکر جانور ہے یا مونث۔" (ریاض السالکین، ص ۲۷۳)

پھر یہی صاحب ریاض السالکین ایک صحیح حدیث سے سماع موتیٰ کا استدلال کرتے ہیں:

۲۶- "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب مردہ کو اس کی قبر میں اُتار آتے ہیں اور لوگ واپس ہوتے ہیں تو مُردہ جانے والوں کی جوتیوں کی آواز سنتا ہے۔" بس اس سے ثابت ہُوا کہ اولیاء اللہ ہمیشہ زندہ ہی ہوتے ہیں۔ (ریاض السالکین، ص ۲۳۷)

دیکھا آپ نے کیا لاجواب ثبوت مہیا فرمایا ہے عرشی صاحب نے۔ بات مُردہ کی ہو رہی ہے اور وہ کافر و مشرک بھی ہوسکتا ہے۔ اور اس سے دائمی زندگی آپ اولیاء اللہ کی ثابت فرما رہے ہیں۔ اگر اس سے دائمی زندگی ثابت کرنا ہی ضروری ہے، تو اس میں اولیاء اللہ کی خصوصیت کہاں سے آگئی؟

۱۰- شیعیت سے لگاؤ کے متعلق موضوعات :

۲۷- عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مَامَرَرْتُ بِسَمَآءٍ اِلَّا وَاَهْلُهَا مُشْتَاقُوْنَ اِلٰى علی ابن ابی طالب (نزہۃ المجالس ۲۳۷، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۱۵۸)

ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں جس آسمان پر گزرا، وہاں کے رہنے والوں کو علی ابن ابی طالب کا مشتاق پایا۔

۲۸- عن ابن عباس قال: حب علی ابن ابی طالب یاکل الذنوب کما تاکل النار الحطب (ریاض النظرہ، ص ۲۸۵)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کی محبت گناہوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جیسے آگ لکڑی کو۔

۲۹- كَانَ اَبُوْ بَكْرٍ رضی اللہ عنہ يُكْثِرُ النظر اِلٰى وَجْهِ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ فَقَالَتْ عائشۃ فقال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: النظر اِلٰى وَجْهِهٖ عبادۃٌ۔ (الصواعق المحرقہ بحوالہ ریاض

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اکثر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے باپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ ایسا کیوں کرتے ہیں، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ: "علی کے چہرہ کی طرف

السالکین، ص ۱۹۹) دیکھنا عبادت ہے۔"

۳۰۔ "حضورؐ فرماتے ہیں کہ: ذکر علی عبادۃ" یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر عبادت ہے۔ یعنی "علی، علی کہنا عبادت ہے۔" (ریاض السالکین، ص ۱۹۹)

۱۱۔ عشق بازی کی فضیلت:

۳۱۔ مَنْ عَشِقَ فَتَعَفَّفَ وَکَتَمَ فَمَاتَ، مَاتَ شَهِیْدًا (تجدید تصوف وسلوک، ص ۱۳۷) جس نے عشق کیا اور بچا رہا اور عشق کو چھپایا، پھر مر گیا تو وہ شہید کی موت مرا۔

۱۲ مجاہدہ وریاضت کی فضیلت:

۳۲۔ رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهادِ الأکبر ہم جہادِ اصغر (جہاد بالسیف) سے جہادِ اکبر (مجاہدہ نفس) کی طرف لوٹ آئے

۱۳۔ خرقہ کی فضیلت:

۳۳۔ مَنْ رَقَّ ثَوْبُهُ رَقَّ دِیْنُهُ (مرشد کامل ترجمہ حدائق الاخیار، ص ۶۵) جس نے اپنے کپڑے کو نرم بنایا اس نے اپنے دین کو نرم بنایا۔

۱۴۔ رجال الغیب سے استفادہ:

یعنی اگر کوئی شخص جنگل میں ہو اور اس کی کوئی چیز گم جائے یا اسے کسی طرح کی مدد درکار ہو تو اسے چاہیے کہ پکارے۔

۳۴۔ اَعِیْنُوْنِیْ یَا عِبَادَ اللہِ اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو

تو رجال الغیب مدد کو پہنچتے ہیں۔ یہ حدیث بھی موضوع اور شرک صریح ہے۔ اگرچہ اس طرح فائدہ ہو بھی جائے۔ تب بھی اس کے شرک ہونے میں کوئی شک نہیں۔ یہی حدیث شش فعل اور ہفت ہیکل جیسے مشرکانہ افعال کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

۱۴۔ دنیوی زندگی میں مشاہدہ باری تعالےٰ:

۳۵۔ حدیث قدسی: اِنَّ اَحَدَکُمْ یَرٰی رَبَّهُ حَتّٰی لَا یَمُوْتُ تم سے ضرور کوئی نہ کوئی مرنے سے بیشتر اپنے رب کو دیکھ لے گا (تعلیم غوثیہ، ص ۱۰۶، بحوالہ ریاض السالکین ص ۲۲۹)

موضوع (رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب من گھڑت) واقعات

اس طرح کی کئی فعلی موضوع احادیث ہم "شیعیت سے لگاؤ" کے عنوان کے تحت درج کر آئے ہیں

۱۔ فوائد الفواد میں مذکور شب معراج میں رسول اللہ ﷺ کو خرقہ عطا ہونے کا۔ پھر آپؐ کا چاروں اصحاب

کو بُلا کر سوال کرنے اور بالآخر یہ خرقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا کرنے کا واقعہ۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یزید کو کندھے پر اٹھا کر گزرنے کا واقعہ۔ اور یہ فرمانا کہ "دوزخی، بہشتی کے کندھے پر سوار ہے۔" یہ واقعہ بھی فوائد الفواد میں مندرج ہے۔

۳۔ آپ کا حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو کربلا کی سُرخ مٹی لا کر دینا اور فرمانا کہ اس کو شیشی میں سنبھال رکھو۔ یہ من گھڑت قصہ خزینۃ الاصفیاء میں مذکور ہے۔ علاوہ ازیں چند اور اسی طرح کے موضوعات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۴۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور درختوں کی شہادت

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر مدینہ کے بعض باغات سے گزرے۔ ناگاہ ایک کھجور کے درخت سے آواز آئی:

هٰذَا مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الْأَنْبِيَاءِ وَهٰذَا عَلِيٌّ سَيِّدُ الْأَوْلِيَاءِ أَبُو الْأَئِمَّةِ الطَّاهِرِيْنَ

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں کے سردار ہیں اور یہ حضرت علی ہیں جو تمام ولیوں کے سردار اور طاہر اماموں کے باپ ہیں۔

اس کے بعد دوسرا درخت بولا:

هٰذَا مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ وَهٰذَا عَلِيٌّ سَيْفُ اللهِ

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ کی تلوار ہیں۔

(صواعق محرقہ، ص ۱۲۳، مطبوعہ مصر، بحوالہ ریاض السالکین، ص ۱۹۹)

معلوم ہوتا ہے کہ دورِ نبوی میں درختوں کی شہادت کا دستور بہت عام تھا۔ پاس کوئی کافر ہو یا نہ ہو وہ شہادت ضرور دے دیا کرتے تھے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں درخت بڑے ڈھیٹ اور بے شرم قسم کے تھے۔ جنہوں نے شہادت کا پہلا جملہ تو ٹھیک ادا کیا، لیکن دوسرا جملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں غلط سلط کہہ گئے۔ وجہ یہ ہے کہ:

۱۔ اولیاء اللہ نے تو تین سو سال بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا سید تسلیم کیا۔ نقشبندیہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا سید تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اس وقت یہ شہادت کیسے درست ہو سکتی تھی۔

۲۔ اور آئمہ ظاہرین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا باپ یا امام تسلیم ہی نہیں کرتے۔ بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی اپنا امام اور رہبر تسلیم کرتے ہیں۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سیف اللہ کہا تھا، لیکن یہ دوسرا درخت آپ کے سامنے آپ کے قول کے خلاف شہادت دینے لگا، جو کچھ بھی ہوا، کم از کم درختوں نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے

اپنی محبت کا ثبوت تو مہیا کر دیا۔

۵۔ سورج کی واپسی

ایک موضوع واقعہ مشہور ہے کہ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نمازِ عصر قضا ہو گئی، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ سورج کو واپس لوٹایا جائے چنانچہ سورج مغرب سے چمکا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز ادا فرمائی۔

اب صاحب خزینۃ الاصفیاء نے اس موضوع قصہ کے آگے ایک فقرہ مزید بڑھا لیا کہ اس دن غروب آفتاب کے وقت ایک دہشت ناک آواز سنائی دی اور دوسرے اس سے ملتا جلتا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب ایک اور واقعہ بیان فرمایا، جو یہ ہے:

"ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ بابل کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ آپ نے دریائے فرات عبور کرتے وقت دیکھا کہ نمازِ عصر قضا ہو رہی ہے، تو آپ نے اور آپ کے چند دوستوں نے تو نماز ادا کر لی، لیکن کچھ دوسرے احباب نماز ادا نہ کر سکے اور سورج غروب ہو گیا۔ یہ لوگ حیران ہو کر آپ کے پاس آئے۔ آپ نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے سورج کو حکم دیا پھر طلوع ہو جائے۔ اس وقت سورج سے ایک ہولناک آواز سنائی دی۔ یہ تمام تسبیح و تہلیل کی آوازیں تھیں۔[۱]" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۶۵)

اب دیکھئے! ان حضرات سے عجوبہ پرستی اور کرامت بیانی کا شوق کیا کچھ کروا دیتا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ ایسی مجبوری کی صورت میں انسان نماز قضاء ادا کر سکتا ہے۔ پھر اس کے لئے حیران و پریشان ہونا اور سورج کی واپسی کی دعائیں۔ پھر سورج کی واپسی۔ اور اس کے ہولناک آوازوں کے مناظر پیش کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟

حاجی محمد قادری نوشاہی کا سورج اور چاند کو ٹھہرانا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس کرامت کے بعد راستہ اور بھی صاف ہو گیا اور ایسے ایسے اولیاء اللہ پیدا ہونے لگے جو سورج کے علاوہ چاند کو بھی حکماً ایک جگہ ٹھہرا سکتے تھے۔ چنانچہ صاحب خزینۃ الاصفیاء حاجی محمد قادری نوشاہی کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ کا ایک مرید جیون حجام موضع باہو کے (جو نوشہرہ سے دو میل کے فاصلہ پر ہے) میں رہتا تھا۔ ایک دن اس نے عرض کی کہ میری کھیتی پر تشریف لائیں، تو میرے لئے باعث عزت و برکت ہو گا۔ آپ التجا منظور فرما

---

[۱] ملا علی قاری مصنف موضوعات کبیر لکھتے ہیں کہ "روافض نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں تین لاکھ روایات وضع کی تھیں۔" (اسلامی

کر چل پڑے۔ نوشہرہ پہنچنے پر نمازِ عصر کا وقت ہو گیا۔ خدام نے چاہا پہلے نماز ادا کریں، پھر چلیں گے۔ یارانِ طریقت یہ سُن کر خاموش ہو گئے مگر سب کے دِل میں یہ خدشہ تھا کہ وہاں پہنچنے تک نماز قضا ہو جائے گی۔ مگر جب آپ وہاں (یعنی باہو کے) پہنچے، تو سورج ابھی تک اسی جگہ قائم تھا۔ دیر تک وہاں آرام کیا اور نماز ادا کرنے کا خیال تک نہ تھا۔ سورج بھی اپنی جگہ سے آگے نہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد جیون حجام کی زمین پر جاکر نماز پڑھی۔ نماز ادا کرنے کے بعد حاضرینِ مجلس سے فرمایا: "دوستو! خدا تعالیٰ کے بندے اب بھی ایسے موجود ہیں کہ اگر وہ چاند اور سورج کو یہ حکم دیں کہ ٹھہر جائیں، تو وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کریں گے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۷۰)

دیکھا آپ نے کہ ایک موضوع حدیث کو بنیاد قرار دے کر خارقِ عادت کا کتنا عظیم الشان قصر تعمیر کر لیا گیا ہے پہلے سورج کی واپسی کا معجزہ تراشا گیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کرامت۔ اب یہ بزرگ سورج کے علاوہ چاند کو بھی حکماً ٹھہرانے والے پیدا ہو گئے۔ تاہم ان تینوں واقعات میں ایک قدرِ مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ حکم عصر کے وقت ہی دیا جاتا ہے۔ آگے پیچھے نہیں۔ شاید اس وقت سورج ان حضرات کا زیادہ فرمانبردار ہوتا ہے۔ اب اقتباسِ بالا کے پروگرام کے مطابق تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورج تقریباً تین گھنٹے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر یہ سورج صرف باہو کے یا نوشہرہ پر تو نہیں چمکتا، بلکہ پوری آدھی دُنیا پر چمک رہا تھا۔ کیا کسی اور جگہ سے بھی اس دن کے تین گھنٹے بڑا ہونے کی شہادت مہیا ہو سکتی ہے؟ نظامِ کائنات میں اتنی بڑی تبدیلی کا علم آخر حاجی محمد نوشاہی اور اس کے مریدوں کو ہی کیوں ہوا؟

۶۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور زمین کی سراغرسانی

بی بی اسماء بنتِ عمیس رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ مجھے بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے شبِ عروسی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ مجھے اس رات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت ڈر آیا، کیونکہ میں نے سنا کہ زمین آپ سے باتیں کر رہی ہے۔ صبح میں نے سرکارِ دو عالم سے بات کی تو سجدہ ریز ہو گئے۔ پھر سر اٹھا کر فرمایا: "فاطمہ! تمہیں پاکیزگیٔ نسب و نسل کی بشارت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے شوہر کو تمام خلائق سے فضیلت دی ہے اور زمین کو حکم دیا کہ اپنی خبریں اسے سنا دیا کرے اور مشرق و مغرب کے حالات اس پر واضح کرے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۱)

معلوم ہوتا ہے کہ زمین اپنی اس ڈیوٹی سے غفلت شعار رہی ہے۔ بلکہ تین مواقع پر تو اس کی یہ غفلت افسوسناک ہے۔ ایک جب آپ نے جنگِ صفین کے موقع پر قرآن کو حکم تسلیم کیا، تو آدھی فوج آپ کے برخلاف ہو گئی۔ دوسرے جب آپ نے حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو حکم تسلیم کر کے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا اور تیسرے جب ایک خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم نے آپ کو صبح کی نماز کی حالت میں شہید کر دیا، تو زمین نے اس کے آنے کی مطلق اطلاع نہ دی۔ ور

آپ ضرور اُس کا کوئی مداوا سوچ لیتے۔

۷۔حضرت ابراہیم بن محمد رضی اللہ عنہ کی وفات کی اصل وجہ

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین کو اپنی دائیں ران پر بٹھاتے تھے اور بیٹے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کو بائیں ران پر۔ اسی حالت میں ایک روز حضرت جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے، اور پیغامِ خداوندی سنایا (گویا یہ حدیثِ قدسی ہے) کہ "ہم دونوں کو آپکے پاس جمع نہیں ہونے دیں گے۔ ایک کو اٹھالیا جائے گا۔ اب آپ کی مرضی ہے جسے چاہیں رکھیں۔" آپ دل میں بڑے فکر مند ہوئے اور سوچا کہ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور خود مجھے بڑا صدمہ ہوگا، لیکن اگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ فوت ہوئے، تو صرف مجھے صدمہ ہوگا، چنانچہ مجھے اپنا صدمہ گوارا ہے، لیکن یہ گوارا نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا غمگین رہیں۔ غرضیکہ اس واقعہ کے تین دن بعد حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ واصل بحق ہو گئے۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۷۳)

روایت نگار پتہ نہیں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا ذکرِ خیر کیوں بھول گئے۔ کہیں یا کبھی کبھی انہیں بھی بٹھلا دیتے، تو اچھا تھا۔ آخر حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے صرف ۱۱ ماہ ہی بڑے تھے۔ ان سے ایسی بے اعتنائی کیوں؟ پھر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ذکرِ خیر سے فضائل اہلِ بیت، جو کہ روایت نگار کا اصل مقصد ہے۔ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتے۔ رہی حضرت ابراہیم کی ماں کے صدمہ کی بات، تو یہ بات کرامت تراش بھول ہی گئے۔

۸۔سورج کا گناہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ

"حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہی دہلوی، "راحت القلوب" میں لکھتے ہیں کہ "ایک دفعہ حضرت عمر اپنے گھر میں آفتاب کی روشنی میں طرف رُخ کئے اپنے کپڑوں کو ٹانکے لگا رہے تھے، چونکہ وقت لگ گیا اس لئے سورج کی گرمی نے آپ کو متاثر کیا۔ آپنے اپنی خشمگین نگاہ آفتاب کی طرف اٹھائی، تو آفتاب سیاہ ہو گیا اور ساری دنیا پر سیاہی چھاگئی۔ اس حال سے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم بڑے متفکر ہوئے۔ اسی وقت حضرت جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہنے لگے: "یارسول اللہ! آج آفتاب نے آپ کے عمرؓ کو خشمگیں کر دیا تھا۔ لہٰذا نورِ آفتاب گہنا گیا ہے۔ ہاں اگر عمرؓ سورج کا گناہ معاف کر دیں تو آفتاب کی روشنی لوٹائی جا سکتی ہے۔ ورنہ قیامت تک آفتاب کو اسی طرح روسیاہ رہنا پڑے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو طلب کیا اور فرمایا کہ آفتاب کا گناہ معاف کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درگزر کیا اور آفتاب کا نورِ عالم تاب اسے لوٹایا گیا۔" (خزینۃ الاصفیاء، ص ۵۴)

غور فرمایا، آپ نے نظام الدین صاحب جیسے بزرگوں کی باتیں کیسی بزرگ اور لاجواب ہوتی ہیں۔ سیدھی سی بات تھی کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دھوپ لگ گئی تھی، تو سایہ میں آ بیٹھتے۔ لیکن اس طرح شاید نگاہِ خشمگین کی کرامت کا ظہور ممکن نہ رہتا۔ لہٰذا فسانہ تراشش کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہِ خشمگیں یا توجہ کا قصہ تراشنا پڑا۔ ہم تو یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ بیچارے آفتاب کا گناہ کیا تھا؟ وہ تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے اپنی ڈیوٹی پر مامور ہے اور آدم اور بنی آدم کی پیدائش سے بہت پہلے سے یہ فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ آخر اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں وہ کون سی انوکھی گستاخی کی تھی جس پر اس قدر برہمی ہوتی تھی کہ قیامت تک کے لئے اس سے نور چھین کر اللہ تعالےٰ کے امر پہ پانی پھیر دینا چاہتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں سورج اس دن گہنایا تھا جب آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔ صحابہ نے یہ تاثر لیا کہ شاید اس سانحہ کی وجہ سے سورج گہنایا ہے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ ان دونوں واقعات کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ سورج کا گہنانا تو اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس موقع پر آپ نے نمازِ کسوف ادا فرمائی اور اللہ کے حضور مغفرت کے لئے آپ نے اور صحابہ نے گڑگڑا کر دعائیں کی تھیں، مگر نظام الدین فرما رہے ہیں کہ سورج گہنا گیا، تو فوراً آپ پر حضرت جبریل علیہ السلام اترے اور کہا کہ عمرؓ سے کہو کہ جلد سورج کا گناہ معاف کر دیا جاتے۔ پھر آپ نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے استدعا کی۔ انہوں نے سورج کو معاف کیا اور اس کی جان بخشی ہوئی۔ اور اسے روشنی واپس لوٹائی گئی۔

۹۔ استمدادِ غیبی کا ثبوت

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زوجہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں اپنی باری کی رات میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے وضو فرمایا اور وضو کے درمیان تین مرتبہ لبیک (حاضر ہوں، امداد کیا گیا، یعنی میں نے تیری مدد کی) فرمایا۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: "آپ کس کے ساتھ ہمکلام ہیں؟" فرمایا: "راجز مجھ سے فریاد کرتا ہے۔" عمرو بن سالم راجز جب مکہ سے مدینہ روانہ ہوا، تو کفارِ مکہ اسے قتل کرنا چاہتے تھے، تو آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غائبانہ پکارنا شروع کیا اور آپ سے امداد طلب کی۔ پس رسول اللہ سے مدد مانگ کیونکہ آپ کی امداد ہر وقت تیار ہے اور اللہ کے بندوں کو پکارو وہ تیری مدد کو پہنچیں گے۔"

(ریاض السالکین، ص ۲۳۶ بحوالہ طبرانی صغیر، ص ۲۰۱)

اب دیکھئے کہ صاحبِ ریاض السالکین عرشی صاحب نے اس موضوع حدیث کا صرف ترجمہ نقل فرمایا ہے۔ یہ موضوع تو اس لئے ہے کہ قرآن کی نصوص صریحہ کے خلاف ہے۔ پھر آپ نے اس کے ترجمہ کے آخر میں اپنی طرف سے جو اضافے فرمائے ہیں وہ لے سے اور بھی چار چاند لگا رہے ہیں۔

غرض اس ولایت کی دنیا میں ایسے واقعات بھی بے شمار ہیں۔ جن میں رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت کر کے آپؐ کے ذمہ جھوٹ لگایا گیا۔ جس کے بارہ میں آپؐ نے یوں فرمایا تھا کہ :۔

من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار (متفق علیہ)

جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا، تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے۔

گھریلو شہادت

اس قسم کی موضوعات اور ایسے بعض دوسرے اولیاء کی کرامات کے من گھڑت قصوں پر جناب پروفیسر حبیب اللہ صاحب تعارف نگار "تاریخ مشائخ چشت" یوں رقمطراز ہیں کہ :

"لیکن اس کتاب "خزینۃ الاصفیاء مصنفہ غلام سرور لاہوری) کا بڑا نقص یہ تھا کہ مصنف نے عقائد کا سہارا لے کر ان تمام اصول اسناد کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا، جو علمائے اسلام کی نظر میں صدیوں تک علم و حکمت کی روح سمجھے جاتے رہے ہیں۔ تنقیدی اصولوں سے چشم پوشی کر کے محض عقائد پر علم کی عمارت تعمیر کرنا کبھی نہیں تو کیا ہے اس قسم کی تحریریں متضاد افکار کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہیں اور بالآخر ان کا نتیجہ بدعقیدگی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء نے اپنی کتاب میں ہیبت ناک قسم کی کرامات کی تفصیل دی ہے جن کو پڑھ کر انسانی عقل و خرد کو شرم آجاتی ہے۔" (تاریخ مشائخ چشت، زیر عنوان تعارف از پروفیسر حبیب اللہ، ص "س")

اب دیکھئے پروفیسر حبیب اللہ صاحب کو خزینۃ الاصفیاء میں صرف دو خامیاں نظر آئیں :۔

۱ اس کی روایات بلا اسناد ہیں۔

۲ اس میں بیان کردہ کرامات ہیبت ناک قسم کی ہیں، جن کو پڑھ کر انسانی عقل و خرد کو شرم آجاتی ہے۔

اور ہم یہ عرض کریں گے کہ ان کوتاہیوں کے مرتکب بچارے اکیلے صاحب خزینۃ الاصفیاء ہی نہیں، بلکہ تمام تذکرہ نگاروں کا یہی حال ہے۔ اور ان کی روایات یوں شروع ہوتی ہیں، نقل ہے منقول ہے۔ فرمایا فلاں نے فرمایا۔ اس قسم کی تھوڑی بہت تفصیل ہم پہلے باب میں لکھ چکے ہیں۔ کرامات کی ہیبت اور عقل و خرد کو شرمانے والی تصویر پیش کرنے میں بھی سب تذکرہ نگار غلام سرور مفتی صاحب کے ہی ساتھی نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان تذکروں میں تاریخی لغزشیں، اور بے احتیاطیاں بھی کافی حد تک موجود ہیں۔

WWW.DEENEKHALIS.COM

باب (۱۰)

شریعت اور طریقت کا تصادم

۱۔ توحید

پچھلے ابواب میں ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جو توحید ہمیں اسلام سکھلاتا ہے۔ اہل طریقت اسے تفرقہ کا نام دیتے ہیں اور جن بزرگوں نے کچھ قرآن وسنت کا پاس رکھا انہوں نے بھی اتنا ضرور کہہ دیا کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ عوام کی توحید ہے۔ خواص کی نہیں اور جو خواص کی توحید (یعنی نظریہ وحدت الوجود) ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے وہ خالصتاً شرک ہے۔ پھر جب توحید کی تعریف[۱] اور قدر میں تبدیلی اور تضاد واقع ہوگیا، تو شرک کی تعریف خود بخود ہی بدل جائے گی۔ لہذا ان دونوں ادیان میں مفاہمت ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایسا دور بھی آیا کہ ہندو لوگ مسلمان فقیروں کے مرید بن گئے اور مسلمان ہندو جوگیوں کے گیان دھیان حاصل کرنے میں کوئی عیب نہ سمجھتے تھے۔ کبیر حالانکہ مسلمان تھا مگر اسی وجہ سے بھگت کبیر مشہور ہوا کہ دینِ اسلام کے بجائے دینِ طریقت کا پیروکار تھا اور اس کے بیشتر مرید ہندو تھے۔ بابا فرید اور گورونانک جیسے بزرگوں نے

---

[۱] صوفیاء کے نزدیک توحید کی تعریف یہ ہے:

اَلتَّوْحِیْدُ تَرْکُ التَّوْحِیْدُ فِی التَّوْحِیْدِ، یعنی توحید کو توحید میں ترک کر ڈالنا ہی توحید ہے۔

سید عبدالقادر جیلانی فرمایا کرتے تھے کہ جب موحد مقام توحید تک پہنچ گیا، تو اس میں موحد ہا نہ توحید نہ واحد، نہ اندک نہ بسیار، نہ خودی نہ خدا، نہ بندہ نہ بندگی، نہ ہستی نہ نیستی، نہ ذات نہ صفات، نہ جبریل نہ قرآن، نہ نبی نہ ولی، نہ ولایت نہ تصرف، نہ صفت نہ موصوف، نہ اسم نہ مسمّٰی، نہ اول نہ آخر نہ ظاہر نہ باطن، نہ بہشت نہ دوزخ، نہ روشنی نہ تاریکی، نہ نفی نہ اثبات، نہ آسمان نہ زمین، نہ عرش نہ فرش، نہ مقام نہ مقیم، نہ طالب نہ مطلوب، نہ عشق نہ معشوق، نہ آدم نہ ابلیس، نہ کفر نہ اسلام، نہ کافر نہ مسلمان، نہ ایمان نہ حلال نہ حرام، نہ وجود نہ روح، نہ مقام نہ استقامت، جب موحد اس مقام پر پہنچ گیا گویا وہ توحید میں آگیا، تو توحید فی التوحید کا مقام حاصل ہوا۔" (ریاض السالکین، ص ۲۵۱)

غور فرمایا آپ نے، ان اہل طریقت کی توحید کیسی لاجواب چیز ہے۔ کیا یہی وہ توحید ہے، جو کتاب و سنت میں مذکور ہے۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو سکھلائی تھی۔ پیرانِ پیر کا یہی وہ شاندار وعظ ہوتا تھا جسے انسانوں کے علاوہ جن، رجال الغیب، ملائکہ حتیٰ کہ رسول اللہ اور دوسرے پیغمبر سننے آیا کرتے تھے اور جس کی تاثیر سے کئی لوگ فوراً مر جایا کرتے تھے اور بعض دوسرے بیہوش ہو جایا کرتے تھے۔

ہندؤں کو مسلمان بنانے کے لئے ایسی ملی جلی تبلیغ چلائی جس کے نتیجہ میں داراشکوہ (برادرِ حقیقی عالمگیر) جیسے صُوفی پیدا ہوئے اور جس سے اسلامی نظریات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اس قسم کی تبلیغ کے نتیجہ میں بے علم صُوفی گمراہ ہو گئے۔

گویا طریقت کا دین اپنے نظریات کی اتباع چاہتا ہے۔ اسے دینِ اسلام یا دوسرے ادیان سے کوئی سروکار نہیں۔ اسی لئے صوفیاء میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ:

اَلصُّوفِیُّ لَا مَذْهَبَ لَهٗ — صوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا

یہاں مذہب سے مراد الہامی مذہب ہے، جو کسی پیغمبر کے متبعین کا مذہب ہو۔ ورنہ طریقت بذاتِ خود مذہب اور ایک دین ہے۔ اب اگر کوئی شخص، خواہ ہندو ہو یا سکھ، عیسائی ہو یا یہودی، اگر اس مذہب میں شامل ہو گا تو اسے اپنے الہامی مذہب کے نظریات و عقائد کو ثانوی حیثیت دینا پڑے گی۔ کیونکہ اب اس کا اصل ایمان طریقت کے عقائد پر ہے۔ ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

معروف کرخی کی وفات پر جھگڑا

جب آپ نے وفات پائی تو یہود و نصاریٰ دعوے کرنے لگے کہ شیخ ہمارے مذہب پر تھے۔ مسلمانوں نے تردید کی۔ نزاع بڑھی۔ خدام کہنے لگے کہ ہمارے شیخ کی وصیت تو یہ ہے کہ "جو ہمارا جنازہ زمین سے اٹھائے گا، ہم اسی سے ہیں۔" اس پر یہود و نصاریٰ نے باری باری اٹھانے کی کوشش کی، مگر اٹھا نہ سکے۔ پھر مسلمان آئے، انہوں نے جنازہ اٹھایا تو اٹھ گیا۔ پھر جس جگہ شیخ نے وفات پائی وہیں انہیں دفن کیا۔ شیخ معروف تجرید و تفرید اور بے سرو سامانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔" (خزینۃ الاصفیاء ص ۱۲۹)

کچھ سمجھے آپ کہ یہ تفرید و تجرید کیا ہے؟ یہود و نصاریٰ کے راہبوں اور مسلمان صوفیوں میں یہی وہ قدر مشترک ہے جس کی بنا پر معروفؒ کرخی کی میت متنازعہ بن گئی تھی اس تجرید و تفرید کو آسان الفاظ میں توحیدِ وجودی کا بلند درجہ سمجھ لیجئے۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ یہ جھگڑا بھی ایک "کرامت" ہی کے ذریعہ ختم ہوا اور یہی کچھ ایسے لوگوں کا مطلوب ہوتا ہے۔

زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین حافظ غلام قادر کی شخصیت

"آپ اپنے زمانے کے قطب الاقطاب اور غوث الاغواث اور محبوبِ خدا تھے۔ جن کا فیضِ روحانی ہر خاص و عام کے لئے اب تک جاری ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو، سکھ، عیسائی، ہر قوم

اور فرقہ کے لوگ آپ سے فیض روحانی حاصل کرتے تھے۔ خاص طور پر کبیر سنگھ بار ایٹ لا، کا تمام خاندان آپ کے بے حد معتقد تھے۔ آپ کے عُرس میں تمام فرقوں کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ آپ سے بے شمار کشف و کرامات سرزد ہوئی ہیں۔ آپ کے تمام مریدانِ باصفا فیضِ روحانی سے مالامال اور "پابند شرع شریف" ہیں۔" (ریاض السالکین، ص ۲۴۲)

اب یہ مرید جس شرع شریف کے پابند ہوں گے۔ وہ آپ خود اندازہ لگا لیجئے۔

مشہور متصوف عبدالکریم جیلی (م ۸۲۰ھ) کی تصنیف "الانسان الکامل" کے مترجم فضل میراں صاحب جب اس کتاب کا ترجمہ لکھنے بیٹھے، تو اس حقیقت کا آغازِ مقدمہ میں ہی برملا الفاظ میں یوں اعتراف فرماتے ہیں، حالانکہ وہ خود بھی اسی طبقہ صوفیاء سے تعلق رکھتے ہیں:

"اکثر صوفیاء کرام کے حقائق و معارف مسئلہ وحدۃ الوجود کے متعلق ہوتے ہیں اور اس مسئلہ نے خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے۔ صوفیاء کے اس قسم کے علوم سے اکثر اہلِ نفس و ہوا دلیر ہو کر شرعی قیود سے نکل گئے۔ شرعی علوم کو قشور (چھلکے) اور ان علوم کو لُبِ لباب یا مغز خیال کر کے ورطۂ الحاد و زندقہ میں جا پڑے ہیں۔ اوّل وہ شخص جس نے دلائل عقلیہ و براہین نقلیہ سے اس مسئلہ کے متعلق گفتگو کی ہے، وہ محی الدین ابن عربی ہیں، جنہوں نے علاوہ مکشوفات کے عقلی تصرف کو بھی اس میں دخل دیا ہے۔ مصنف "انسان کامل" کے علوم بھی اسی قبیل سے ہیں۔۔۔۔ علمائے ظاہر جب دیکھتے ہیں کہ ایسے علوم جن میں عابد و معبود کی ایک ہی حقیقت ہے۔ تکلیفِ شرعی کو بالکل ساقط کر دیتے ہیں اور جو آیات و احادیث بطور شواہد کے حقائق وجودیہ کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسی ہوتی ہیں، جو خالی از تکلفات نہیں ہوتیں، تو اکثر علمائے کرام صوفیاء سے بد اعتقاد ہو جاتے ہیں۔" (مقدمہ از مترجم، ص ۹)

پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لیکن ان (صوفیاء کے علوم) کے مواطن، ماخذ اور سرچشمے علومِ نبوت کے مواطن اور سرچشمے سے جداگانہ ہیں شرعی علوم بھی بطریق اعتبار و اشارہ ان کی تائید کرتے ہیں نہ کہ بطریق تفسیر و فحوائے کلام اور یہ شرعی علوم و کمالاتِ نبوت کی ایک اعجازی خاصیت ہے۔ ورنہ شریعت کی راہ اور ہے اور ان صوفیوں کی راہ اور، جو مسائل وحدتُ الوجود بقا و فنا، لطائف کائنہ فطرت کی تہذیب و ترتیب میں اپنی تصنیفات چھوڑ گئے ہیں۔" (ایضاً، ص ۱۰)

دیکھا آپ نے مولوی فضل میراں صاحب نے کس قدر وسعتِ ظرفی سے ان حقائق کا اعتراف کر لیا ہے کہ علمائے شریعت کے یا علومِ نبوت کے موطن اور سرچشمے الگ ہیں اور وہ موطن اور سرچشمے وحی الٰہی ہے اور صوفیا کے موطن اور سرچشمے الگ ہیں اور یہ موطن اور سرچشمے ان کے اپنے مکشوفات اور مشاہدات ہیں۔ لہٰذا شریعت کی

راہ اور ہے اور طریقت کی راہ اور۔ اور ان دونوں میں اتحاد ناممکن ہے اور یہیں سے خُدا کی ذات کے متعلق یعنی عقیدہ توحید سے متعلق اختلاف شروع ہوجاتا ہے۔

بعض صوفیوں نے اپنے اس دین طریقت کے دین اسلام سے الگ ہونے کا برملا اعتراف کر لیا۔ وہ اپنے اس دین کی ترجمانی درج ذیل شعر سے کرتے ہیں ؎

ملّتِ عشق از ہمہ ملت جُدا است　　　عاشقاں را مذہب و ملّت خُدا است

یعنی عشق کا مذہب تمام مذہبوں سے الگ ہے۔ عاشقوں کا ملّت اور مذہب سب کچھ خُدا ہی ہوتا ہے ان کا رسول سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

۲۔ رسالت

توحید کے بعد رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے کہ محمد ﷺ، اللہ کے بندے اور اُس کے رسُول ہیں۔ وہ تاقیامت رسُول ہیں اور سب بنی نوعِ انسان کے لئے رسول ہیں۔ وہ آخری نبی ہیں اُن کے بعد کوئی نہیں آئے گا اور ہر مسلمان پر اُن کی اتباع لازم و واجب ہے۔ وہ خیر البشر اور افضل الانبیاء ہیں ان کی اطاعت اور محبت ایمان کا لازمی حصہ ہے۔

اس معاملہ میں بھی اہلِ طریقت بھٹک کر اور افراط و تفریط سے کام لے کر کئی راہوں پر چل نکلے:

ایک فریق جو ابنِ عربی کو شیخِ اکبر تسلیم کرتا ہے، اس بات کا قائل ہے کہ نبوت سے ولایت افضل ہے اور خاتم الانبیاء سے خاتم الاولیاء افضل ہوتا ہے۔ اس فریق نے لاتعداد ولیوں کو رسول اکرم ﷺ سے برتر قرار دے کر آپ کی شان میں انتہا درجہ کی گستاخی کی اور آپ کی قدر و منزلت کو اپنے اصل مقام سے نیچے گرا دیا۔ اور شیخ اکبر خود خاتم الاولیاء کے مقام پر فائز ہوئے اور نبوت کو اکتسابی قرار دے کر آئندہ کے لئے نبوت کا دروازہ کھول دیا۔ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی اور دوسرے قادیانی حضرات ان کے اقوال سے بکثرت استفادہ کرتے ہیں۔

اب دیکھئے! عبدالکریم جیلی صاحب کس انداز میں مقامِ رسالت بیان فرماتے ہیں:

"نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے لئے تصریح فرمائی، جبکہ اس نے ان کو خواب میں دیکھا اور کہا کہ اے رسولِ خُدا! مجھے معذور رکھئے، محبتِ الٰہی نے مجھے آپ کی محبت سے

باز رکھا ہے۔ پھر آپ نے اسے فرمایا کہ "اے مبارک! اللہ کی محبت ہی میری محبت ہے۔ پس جب محمد ﷺ وہاں اللہ کے خلیفہ تھے، تو اللہ یہاں محمد ﷺ کا نائب تھا" اور نائب خلیفہ کو کہتے ہیں اور خلیفہ نائب کو۔ پس وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) یہ (یعنی محمد ﷺ) ہیں۔ اور یہ (محمد ﷺ) وہ (اللہ تعالیٰ) ہیں۔ یہیں سے ہے کہ محمد ﷺ کمال میں متفرد ہوئے۔" (انسان کامل، ص ۲۴۲)

اس اقتباس میں جیلی صاحب نے:

۱۔ اپنے دل سے گھڑی ہوئی بات کو حدیث بنا کر پیش کر دیا اور یہ وضع حدیث کا فتنہ اس طبقہ میں موروثی طور پر پایا جاتا ہے۔

۲۔ پھر اس موضوع حدیث کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی محبت کو جو ایمان کا جزو اعلیٰ ہے خارج از بحث قرار دے دیا، حالانکہ اللہ کی محبت کا دعوٰے تو تمام ادیانِ باطلہ بھی کرتے ہیں اور یہی دین طریقت کا نچوڑ ہے کہ وہ اللہ تک تو رسائی چاہتے ہیں مگر انہیں رسول کی ضرورت[1] نہیں ہوتی۔

۳۔ اس موضوع حدیث کے ذریعہ عقیدہ حلول کو بھی ثابت کر دکھایا۔

پھر ایک دوسرے مقام پر جیلی صاحب صوفیانہ اصطلاح قطب اور رسول کا تعلق بیان فرما کر رسالت کا اجرا ثابت کرتے ہیں اور بعد میں آنے والے رسولوں کی نشاندہی بھی فرما رہے ہیں جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے واضح ہے:

نئے رسول

"انسان کامل وہ قطب ہے جس پر اول سے آخر تک وجود کے فلک گردش کرتے ہیں اور وہ جب سے وجود کی ابتدا ہوئی اس وقت سے لے کر ابدالآباد تک ایک ہی شے ہے۔ پھر اس کے لئے رنگا رنگ لباس ہیں اور کنیسوں اور گرجوں میں ظاہر ہوتا ہے اس کا اصلی نام محمد ﷺ ہے، کنیت ابوالقاسم، وصف عبداللہ اور لقب شمس الدین ہے۔ پھر ہر زمانہ میں زمانہ کے لباس کے مطابق اس کا ایک نام ہے۔ پس میں (یعنی مصنف عبدالکریم جیلی) محمد ﷺ کے ساتھ اپنے شیخ شرف الدین اسمٰعیل الجبرتی کی صورت میں جمع ہوا اور میں نہیں جانتا کہ وہ نبی ﷺ ہیں۔ میں یہی جانتا تھا کہ وہ میرے شیخ ہیں۔ جن کو میں نے زبید میں ۷۹۶ھ میں مشاہدہ کیا ہے اور اس امر کا بھید یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ہر صورت میں متصور ہو سکتے ہیں۔ البتہ صورت کے لحاظ سے نام بدل دیا جاتا ہے۔ اور دراصل وہ نام بجز حقیقت محمدیہ کے کسی اور شے پر واقع نہیں ہوتا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ جب آپ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی صورت میں ظاہر ہوتے تو

---

[1] اسی نظریہ کو دارا شکوہ کے استاد ملا بدخشی نے یوں ادا کیا ہے

پنجہ در پنجۂ خدا دارم   من چہ پروائے مصطفیٰ دارم

شبلی نے اپنے تلمیذ سے کہا کہ مَیں اس اَمر کی شہادت دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہُوں۔ تلمیذ صاحبِ کشف تھا۔ اس نے نورِ کشف سے پہچان لیا اور کہا کہ مَیں بھی گواہی دیتا ہوں کہ تُو اللہ کا رسول ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کا انکار نہیں کیا جاتا۔" (انسان کامل، ص ۲۴۵)

دوسرا فریق وہ ہے جس نے آپ کی شان کو اتنا بلند کیا کہ خدا کے ساتھ ملا دیا۔ آپ کو ہر جگہ حاضر ناظر اور عالم الغیب کُلّی قرار دیا۔ آپ کے جسم میں اللہ تعالےٰ کو اتارا اور اس طرح آپ کو خدا ہی تسلیم کر لیا۔ یہ بھی دراصل دینِ طریقت کے نظریات کی مجبوری ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی امت ہونے کی وجہ سے جب تک آپؐ کو اس مقام پر فائز نہ کر لیں، ان کی اپنی راہ صاف نہیں ہوتی۔

رسول اکرم ﷺ کا نُور

ایک تیسرا فریق اس سے بھی آگے بڑھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ جُملہ کائنات سے پہلے حضور ﷺ کا نور پیدا کیا گیا۔ پھر اس نورُ سے باقی تمام کائنات وجود میں آئی ہے۔ اللہ تعالےٰ تو فرماتے ہیں کہ :

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱/۳۰) اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو پیدا کیا۔

لیکن یہ حضرات آپ کے نُور سے ہر چیز کے پیدا ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔

پہلے دو فریقوں کے نظریات پر ہم مناسب مقامات پر بحث کر آئے ہیں۔ اب اس تیسرے فریق کے دعوےٰ کا بھی جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ اس کے دعوےٰ کی بنیاد درج ذیل موضوع حدیث ہے۔

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ اللہ نے جو چیز سب سے پہلے پیدا کی، وہ میرا نور تھا۔

یہ حدیث موضوع ہونے کے باوجود صوفیاء میں بہت مقبول ہے اور یہ تو ہم بتلا چکے ہیں کہ ان کے ہاں حدیث کی صحت کا معیار، ان کے اپنے مشاہدات، مکاشفات اور نظریات ہوتے ہیں اگرچہ وہ روایت یا درایت کے لحاظ سے کتنی ہی ضعیف ہو۔

اب دیکھئے، اس حدیث کے موضوع ہونے کے دلائل یہ ہیں :

۱۔ صحاح ستہ میں اس حدیث کا سراغ تک نہیں ملتا۔

۲۔ اس حدیث کا ماخذ "مصنف عبدالرزاق" ہے، جو تیسرے درجہ کی کتاب ہے اور اس میں ضعیف و متروک تو درکنار، موضوعات تک شامل ہیں۔

۳۔ اس حدیث کے راوی حضرت جابر رضی اللہ عنہ بتلائے گئے ہیں، لیکن اسناد مذکور نہیں۔ لہٰذا ویسے بھی

مردود ہے۔ پھر مصنف عبدالرزاق کی حدیث اور اس حدیث کے الفاظ بھی نہیں ملتے، صرف مفہوم ملتا جلتا ہے اور وہ الفاظ یوں ہیں : اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرُ نَبِیِّكَ یَا جَابِر۔

۴۔اس کے بجائے ترمذی ابواب القدر میں ایک صحیح حدیث بھی موجود ہے جو یوں ہے :۔

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ الْقَلَمُ — اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔

لیکن یہ حضرات قلم کو بھی آپ کے نور سے پیدا کر کے صحیح حدیث کو رد کرتے ہیں اور اس موضوع حدیث کو اپناتے ہیں۔

عالم اکبر اور عالم اصغر

اب سوال یہ ہے کہ صوفیاء میں یہ حدیث کیوں اس قدر مقبول ہے ؟ تو اس کا پس منظر یہ ہے کہ اسلامی تصوف پر یونانی فلسفہ کی گہری چھاپ ہے، جو مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ جو کچھ انسان کے بدن میں موجود ہے، وہی کچھ کائنات میں ہے۔ گویا انسان عالم اصغر ہے اور کائنات عالم اکبر۔ بالفاظ دیگر کائنات "انسان اکبر" اور "انسان" "کائنات اصغر"۔ انسان کے افعال و اعمال اس کے ارادہ کے تابع ہوتے ہیں۔ ادھر انسان نے کسی کام کا ارادہ کیا۔ اِدھر اعضاء جوارح نے خود بخود حرکت شروع کر دی اور اس کا منبع انسان کا دماغ یا اس کی عقل ہے۔ گویا اعمال و افعال کے ظہور اور صدور سے پیشتر عقل کا ہونا ضروری ہے۔ پھر چونکہ انسان عالم اصغر ہے اس لئے اس کی عقل بھی، عقل جزء ہوئی۔ اب عالم اکبر یا کائنات کا نظام چلانے کے لئے، جس کے تحت کائنات میں ہر وقت حوادث کا ظہور و صدور ہو رہا ہے، ایسی عقل کا پہلے سے موجود ہونا ضروری ہے، جو کُل کائنات پر محیط اور اس پر کنٹرول کر سکے، لہٰذا وہ عقل بھی عقلِ کُل ہوئی۔ اسی عقلِ کُل کو عقلِ اوّل کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اسی عقلِ اول یا عقلِ کُل کو مذہب کی زبان میں خدا کہا جاتا ہے۔

نورِ محمد ﷺ اور عقولِ عشرہ

اب اس فلسفہ کا اگلا مرحلہ یہ ہے کہ عقلِ اول صرف ایک نئی چیز کو وجود میں لا سکتی ہے اور وہ عقلِ دوم کہلائے گی۔ پھر یہ دونوں عقول مل کر تیسری چیز پیدا کریں گی، جو عقلِ سوم کہلائے گی۔ اسی طرح یہ سلسلہ دس عقلوں یا عقولِ عشرہ تک چلتا ہے اِن عقولِ عشرہ کے بعد عام کائنات وجود میں آئی یا لائی گئی۔ انہیں پیدا شدہ مختلف عقول کو مذہبی زبان میں خدا عرش کرسی اور افلاک وغیرہ وغیرہ کہا جاتا ہے۔

اب صوفیاء کا عقیدہ یہ ہے کہ عقلِ اوّل یا خُدا نے جو عقلِ دوم پیدا کی تھی، وہ حضورِ اکرم ﷺ کا نور تھا، اب سوال یہ ہے کہ وہ دوسری چیز حضور اکرم ﷺ کا نور کیوں تھا ؟ تو اس نکتہ کی باریکیاں تو متکلمین سمجھیں یا فلاسفہ بہر حال صوفیاء کے ہاں یہ مسئلہ مسلّم ہو گیا کہ وہ دوسری چیز حضور ﷺ کا نور تھی۔ اب اس نور کے متعلق اور اس کی

ہمہ گیری کے متعلق صوفیاء کے ارشادات اِن کی اپنی زبان میں سنیئے!

"ظاہر ہے کہ دنیا کی اشیاء کا ہدایت پر قائم رہنا الہامِ الٰہی کے سوا ممکن نہیں اور الہامِ الٰہی بجز وسیدہ نبی حاصل نہیں پس سب کائنات کا پیغمبر کے زیرِ سایہ رہنا ضروری ہُوا۔" (سرچشمۂ حیات، ص ۵۰)

"دربارِ خاص۔ سلطان باہُو کی تصانیف نور الہدیٰ وغیرہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہی فضاؤں میں کسی جگہ سرورِ عالم ﷺ کا دربارِ خاص ہر روز انعقاد پذیر ہوتا ہے۔ جہاں روحانی ہستیوں کی وساطت سے باریابی حاصل کی جا سکتی ہے۔" (سرچشمۂ حیات، ص ۴۳)

"سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جو چیز پیدا کی ہے وہ آنحضرت ﷺ کا نور ہے۔ پھر اس سے ایک جوہر پیدا کر کے اسے بنظرِ قبولیت دیکھا وہ پانی ہو گیا اور اس پر جھاگ آ گئی۔ جھاگ سے خدا نے رُوحیں پیدا کیں۔ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی روح، پھر انبیاء، پھر مومنوں کی ارواح پیدا کیں۔ اسی طرح اس سے اجسام پیدا کئے۔ اسی وقت ارواح کا اجسام سے تعلق پیدا ہو گیا۔ پہلے عالمِ ارواح ہے، پھر عالمِ اجسام۔ ارواح کے مدارج مختلف ہیں۔ سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کی رُوح۔ پھر اولوالعزم رُسل کی ارواح، پھر انبیاء، پھر صدّیق، پھر اولیاء، پھر عارف، پھر زاہد، پھر عابد اور سب سے گھٹیا عامۃ المسلمین کی ارواح ہیں۔"

"اہلِ معرفت کہتے ہیں کہ کافروں کی روحیں ایمان کے مقام تک نہیں پہنچتیں۔ حیوانات و نباتات کی روحیں عالمِ سفلی سے ہیں۔ عالمِ علوی کی طرف چڑھ نہیں سکتیں۔ عالمِ علوی کی روحیں اپنے مقام سے عالمِ سفلی کی طرف اترتی اور جسموں میں قرار پکڑتی ہیں اور جب تک قالب میں رہتی ہیں کمال حاصل کرتی رہتی ہیں۔" ...... اس کے بعد ہندوؤں کے مسئلہ تناسخ کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ (مرشدِ کامل، ص ۲۸)

عقلِ اوّل کی مختلف توجیہات

اب اس عقلِ اول کے متعلق دیگر صوفیانہ اسرار و رموز عبد الکریم جیلی کی زبان سے سنیئے:

"پھر جان کہ عقلِ اوّل کا علم اور قلمِ اعلیٰ ایک ہی نور ہیں کہ جب بندہ کی طرف اس کی نسبت کرے گا، تو اس کا نام عقلِ اوّل ہوتا ہے اور جب حق کی طرف اس کی نسبت کریں، تو اس کا نام قلمِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ پھر عقلِ اوّل جو محمد ﷺ کی طرف منسوب ہے۔ اوّلاً اس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو پیدا کیا ہے پس آنحضرت ﷺ اس جہت سے جبریل علیہ السلام کے باپ اور جمیع عالم کے اصل ہیں.... عقلِ اوّل کا نام رُوح امین اس جہت سے رکھا گیا ہے کہ وہ علمِ الٰہی کا خزانہ اور امین ہے اور حضرت جبریل علیہ السلام کا یہ نام اصل کے نام پر فرع کا نام رکھنا ہے۔ اس لئے کہ وہ عقلِ اوّل کی فرع ہیں۔ فافہم۔" (انسانِ کامل ۲۶۸)

اس گورکھ دھندے کو بار بار پڑھئے اور بتلائیے کہ عقلِ اول قلمِ اعلیٰ ہے یا آنحضرت ﷺ یا حضرت جبریل علیہ السلام (روح الامین)؟ نیز یہ بھی کہ حضور اکرم ﷺ حضرت جبریل علیہ السلام کے باپ کیسے ہوئے؟ اور یہ بھی کہ کیا ابتدائے کائنات سے متعلق اسلام کی سادہ اور فطری تعلیم کا صوفیاء کے اس فلسفیانہ گورکھ دھندے سے کچھ تعلق ہے؟

پھر اس کے بعد جیلی صاحب فرشتوں کی پیدائش کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں کہ:

"جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے فکرِ محمدی کو اپنے اسم ہادی، رشید' کے نور سے پیدا کیا اور اس پر اپنے اسم مُبدِء و معید سے تجلی فرمائی۔ پھر اس کی طرف اپنے اسم باعث شہید کی آنکھ سے دیکھا، جب فکر (محمدی) نے ان اسماءِ حسنیٰ کے اسرار جمع کر لیئے اور ان صفاتِ علیا کے لباس میں عالم میں ظاہر ہوئی، تو اللہ تعالےٰ نے فکرِ محمدی سے تمام آسمانوں اور زمینوں کے فرشتوں کی روحیں پیدا کیں۔" (انسان کامل، ص ۲۸۵)

۲۔ قرآن

قرآن کریم وہ ہدایت کی کتاب ہے، جو وحی کے ذریعے رسول اکرم ﷺ پر نازل ہوئی، وہ ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس پر ایمان لانا اور اس کے جملہ احکام کی پیروی کرنا، سب مسلمانوں پر لازم و واجب ہے۔

اس سلسلہ میں بھی اہلِ طریقت افراط و تفریط کا شکار ہوئے ہیں۔ ایک فریق تو ابنِ عربی کا ہے۔ یہ صوفیاء کے شیخ اکبر قرآن کا جواب لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ جب یہ وحدت الوجود کی عینک لگاتے ہیں، تو انہیں تمام مشرک لوگ موحد نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر ان ہی کے خوشہ نشیں تلمسانی صاحب فرماتے ہیں کہ "قرآن میں توحید ہے کہاں۔ وہ تو شرک سے پُر ہے۔ ایسے قرآن و حدیث کو دروازے باہر پھینک دو۔" وغیرہ وغیرہ، جن کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔

دراصل یہ لوگ جب اپنے مشاہدات و نظریات کی سان پر قرآن کو چڑھاتے ہیں اور یہ ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا، تو انہیں کتاب اللہ میں بھی شک پیدا ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض مسلّمہ بزرگ ہستیوں سے بھی ایسے الفاظ نکل گئے۔ مثلاً

فرشتوں کا سجدہ اور مجدد الف ثانیؒ

اللہ تعالےٰ نے ان سب فرشتوں سے اشرف المخلوقات حضرت آدم علیہ السلام، کو سجدہ کروایا تھا۔ اس کی خبر اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم

میں دو مقامات پر ان الفاظ سے دی ہے ۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۔ پھر سب کے سب فرشتوں نے اکٹھے ہو کر سجدہ کیا ۔

(ص ۳۸ ، آیت ۷۳ ، الحجر ۱۵ ، آیت ۳۰)

اب حضرت مجدد الف ثانی نے فنا فی اللہ ہونے کی حیثیت سے ذاتِ الٰہی سے متصل ہو کر انسانیت کی ابتدار سے متعلق جو بہ چشم خود نظارہ فرمایا ، وہ یوں ہے :

"اس فقیر کو بھی اللہ کے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صدقے بعض اوقات یہ حالت پیش آئی ہے اور میں نے ملائکہ کو عین سجود کی حالت میں پایا ہے ، جو وہ حضرت آدم علیہ السلام کو کر رہے تھے کہ اب تک انہوں نے سجدہ سے سر بھی نہیں اٹھایا تھا اور ملائکہ علیین کو جنہیں سجدہ کا حکم نہیں دیا گیا تھا ۔ ان سجدہ کرنے والے فرشتوں سے الگ دیکھا ۔ کہ وہ اپنے مشہود میں (جس کا وہ مشاہدہ کر رہے تھے) فنا اور غرق ہیں ۔" (ترجمہ مبدا و معاد مصنفہ شیخ احمد سرہندی ۔ مترجم زوار حسین صاحب ، ص ۱۸۸)

آپ کے مکاشفہ یا مشاہدہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں :

۱ ۔ ایک تو یہ کہ قرآن کریم کی دو آیتوں کی تصحیح ہو گئی ۔ یہ غلطی کس مقام پر واقع ہوئی ۔ حضرت جبریل سے یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے ۔

۲ ۔ دوسرے یہ کہ ملائکہ میں بھی دینِ طریقت رائج ہے اور کچھ اونچے درجہ کے فرشتے اللہ کی ذات میں فنا اور غرق رہتے ہیں ۔ وہ اس کے احکام کے پابند نہیں ہیں ۔

مجدد الف ثانی سے پیشتر عبدالکریم جیلی نے بھی فرشتوں کے متعلق اپنا ذاتی مشاہدہ اسی طرح اور زیادہ تفصیل سے پیش کیا تھا ، بلکہ اس نے تو بعض مقربین کے نام بھی بتلا دیئے ۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ :

پھر میں نے (یعنی عبدالکریم جیلی نے ساتویں آسمان پر) ان سو فرشتوں میں سے سات کو دیکھا کہ وہ ان سب سے آگے ہیں اور ان کا نام قائمۃ الکروبیین ہے اور ان سات میں سے میں نے تین کو دیکھا ، جو ان سات پر مقدم تھے اور ان کا نام اہل المراتب والتمکین تھا اور ایک کو میں نے سب پر مقدم پایا ، جس کا نام عبداللہ تھا اور یہ تمام وہ عالین فرشتے ہیں ، جو سجودِ آدم کے لئے مامور نہ تھے اور ان کے اوپر بھی فرشتے ہیں مثلاً نون فرشتہ اور قلم فرشتہ اور ان کی مانند اور بھی کہ وہ بھی عالین میں داخل ہیں اور باقی ملائکہ مقربین ان سے ادنیٰ اور ان سے نیچے ہیں ۔ مثلاً جبرائیل ، میکائیل ، اسرافیل ، عزرائیل اور ان کی مانند اور فرشتے ۔"

دیکھ لیا آپ نے ان لوگوں کے مشاہدات و مکاشفات کس قدر وحی الٰہی سے متصادم ہوتے ہیں۔

قرآن کا ثواب

پھر ایک دوسرے گروہ کو قرآن کے احکامات اور تعلیمات سے کچھ سروکار نہیں۔ وہ اس قرآن کے تعویذ اور عملیات بنانے اور محض اس کی تلاوت میں اتنا ثواب حاصل کرنے یا فوت شدہ لوگوں کو بھیجنے میں مصروف ہے، جس کا آپ وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھئے ایک بزرگ حضرت بشر حافی قرآن کی برکات اور اس کا ثواب کس انداز میں پیش کر رہے ہیں :

آپ نے فرمایا : "ایک بار میں نے قبرستان میں مُردوں کو دیکھا کہ آپس میں کچھ بانٹ رہے ہیں، میں نے دُعا کی : "الٰہی ! ان کے حال سے آگاہ فرمایئے۔" حکم ہوا "ان ہی سے پوچھو۔" میں نے پوچھا : "کیا بانٹ رہے ہو ؟" انہوں نے کہا : "آٹھ روز ہوئے کہ ایک اللہ کا بندہ اس طرف سے گزرا۔ اس نے تین بار قُل شریف کا ثواب پڑھ کر ہم کو بخشا، اسی ثواب تک بانٹ رہے ہیں اور ابھی ختم نہیں ہوا۔" (مقربانِ حق، ص ۱۸)

دیکھئے ! اس کرامت کی اختراع سے کتنے متنازعہ مسائل حل ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ رُوحیں اس جہاں میں قبرستانوں میں واپس آتی ہیں، دوسرے سماع موتیٰ کا مسئلہ حل ہُوا، تیسرے صوفیاء کے کشف اور ان رُوحوں کے جواب دینے کا اور چوتھے قبروں میں بیٹھ کر قرآن پڑھنے کی بدعت کا۔ آخر کیوں نہ ہو، ثواب بھی تو اتنا زیادہ تھا۔

۴۔ اتباعِ سُنّت

کہنے کو تو صوفیاء اتباعِ سنّت کی تلقین کرتے ہی رہتے ہیں مگر جو حضرات نبوت سے ولایت کو افضل اور قرآن و حدیث کے علم سے کشفی علم کو زیادہ معتبر سمجھتے ہوں وہ بھلا کہاں تک سنّت کی اتباع کر سکتے ہیں۔ ایسے بہت سے احکامات کی ہم نشان دہی کر چکے ہیں۔ جہاں یہ لوگ رسول کے حکم کی پرواہ تک نہیں کرتے مثلاً مزارات کے وجود سے حضورِ اکرم ﷺ نے بہت سختی سے منع فرمایا۔ اب کتنے بزرگ ہیں جو اپنے مقبرے نہیں بنتے یا وہ مقبروں پر جا کر مراقبہ نہیں کرتے۔ ایسے مسائل تو بے شمار ہیں مگر ہم یہاں صرف نفلی عبادات نماز، روزہ اور شب بیداری کا ذکر کریں گے۔ اس کے بعد نکاح کے متعلق تبصرہ کریں گے۔ نفلی عبادات کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی درج ذیل ہیں :

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ	عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے والد
اَنْكَحَنِىْ اَبِىْ امْرَاَةً ذَاتَ حَسَبٍ	(عمرو بن عاص) نے ایک حسب والی (قریش کی) عورت سے
فَكَانَ يَتَعَاهَدُ كَنَّتَهٗ فَيَسْاَلُهَا عَنْ بَعْلِهَا	میرا نکاح کر دیا اور ہمیشہ اس کی خبر گیری کرتے رہتے

فَتَقُوْلُ : "نِعْمَ الرَّجُلُ مِنْ رَجُلٍ لَمْ يَطَأْ لَنَا فِرَاشًا وَ لَمْ يُفَتِّشْ كَنَفًا مُذْ اَتَيْنَاهُ" فَلَمَّا طَالَ ذٰلِكَ عَلَيْهِ ذَكَرَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ "اَلْقِنِيْ بِهٖ" فَلَقِيْتُهٗ بَعْدُ فَقَالَ : "كَيْفَ تَصُوْمُ ؟" قَالَ "كُلَّ يَوْمٍ" قَالَ وَكَيْفَ تَخْتِمُ ؟" قَالَ كُلَّ لَيْلَةٍ !" قَالَ صُمْ فِيْ كُلِّ شَهْرٍ ثَلٰثَةً وَاقْرَاءَ الْقُرْاٰنَ فِيْ كُلِّ شَهْرٍ" قُلْتُ : "اُطِيْقُ اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ" قَالَ : "صُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ فِي الْجُمُعَةِ" قُلْتُ : اُطِيْقُ اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ" قَالَ : "اَفْطِرْ يَوْمَيْنِ وَ صُمْ يَوْمًا" قُلْتُ : "اُطِيْقُ اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ" قَالَ : "صُمْ ، اَفْضَلَ الصَّوْمِ صَوْمَ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ صِيَامَ يَوْمٍ وَ اِفْطَارَ يَوْمٍ وَ اقْرَءْ فِيْ كُلِّ سَبْعِ لَيَالٍ مَرَّةً" فَلَيْتَنِيْ قَبِلْتُ رُخْصَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ ذٰلِكَ اَنِّيْ كَبِرْتُ وَ ضَعُفْتُ فَكَانَ يَقْرَءُ عَلٰى بَعْضِ اَهْلِهٖ السَّبْعَ مِنَ الْقُرْاٰنِ بِالنَّهَارِ

اور اس کے خاوند (یعنی میرے) متعلق پوچھتے رہتے۔ وہ کہتی: "اچھا آدمی ہے مگر جب سے اس کے نکاح میں آئی ہوں، نہ تو اس نے میرے بستر پر قدم رکھا اور نہ میرے کپڑے میں ہاتھ ڈالا۔ پھر جب ایسے ہی ایک مدت گزر گئی، تو میرے والد نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: "اسے میرے پاس لاؤ" چنانچہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ نے پوچھا: "روزے کیسے رکھتا ہے؟" میں نے کہا: "ہر روز روزہ رکھتا ہوں۔" پھر آپ نے پوچھا: "قرآن کتنے دنوں میں ختم کرتا ہے؟" میں نے کہا: "ہر رات میں ختم کرتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "ہر مہینہ میں تین روزے رکھ اور ایک ماہ میں قرآن ختم کر۔" میں نے کہا: "میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "اچھا تو پھر ہر ہفتہ میں تین روزے رکھ۔" میں نے کہا: "میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "اچھا تو پھر دو دن روزہ چھوڑ اور ایک دن روزہ رکھ۔" میں نے عرض کیا: "مجھ میں اس سے زیادہ طاقت ہے۔" آپ نے فرمایا: "اچھا تو روزوں میں سے سب سے بہتر روزہ یعنی حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ اختیار کر لو۔ ایک دن روزہ رکھ اور دوسرے دن روزہ چھوڑ۔ اور قرآن کو سات راتوں میں صرف ایک بار ختم کیا کر۔" (عبداللہ بن عمرو کہا کرتے تھے) کاش! میں رسول اللہ ﷺ کی رخصت کو قبول کر لیتا۔ اب میں بوڑھا اور ضعیف ہو گیا ہوں۔ مجاہد کہتے ہیں کہ بڑھاپے

وَالَّذِي يَقْرَءُوهُ يَعْرِضُهُ مِنَ النَّهَارِ لِيَكُونَ أَخَفَّ عَلَيْهِ بِاللَّيْلِ وَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَتَقَوَّى أَفْطَرَ أَيَّامًا وَأَحْصَى وَصَامَ مِثْلَهُنَّ كَرَاهِيَةَ أَنْ يَتْرُكَ شَيْئًا فَارَقَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

میں عبداللہ بن عمرو یوں کرتے کہ قرآن کا ساتواں حصہ یعنی ایک منزل دن میں کسی کو سنا دیتے یعنی جو رات کو پڑھنا ہوتا وہ دن کو سنا رکھتے تاکہ رات کو اس کا پڑھنا آسان ہو جائے۔ اور قوت حاصل کرنے کے لئے یوں کرتے کہ چند روز تک برابر افطار کرتے اور دن گنتے جاتے۔ پھر اتنے ہی دن برابر روزہ رکھتے، کیونکہ انہیں یہ برا معلوم ہوا کہ جو بات نبی ﷺ سے ٹھہرائی تھی اس میں کمی واقع ہو۔

وَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ وَقَالَ بَعْضُهُمْ فِي ثَلَاثٍ وَفِي خَمْسٍ وَأَكْثَرُهُمْ عَلَى سَبْعٍ

(بخاری، کتاب فضائل القرآن باب فی کم یقرء القرآن)

امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض راوی تین راتوں یا پانچ راتوں میں ختم کرنے کے متعلق بھی کہتے ہیں، مگر ان کی اکثریت سات راتوں میں ختم کرنے کی ہی روایت کرتی ہے

(۲) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اقْرَأِ الْقُرْآنَ فِي شَهْرٍ" قُلْتُ: إِنِّي أَجِدُ قُوَّةً قَالَ: فَاقْرَأْهُ فِي سَبْعٍ وَلَا تَزِدْ عَلَى ذٰلِكَ" (بخاری، حوالہ ایضاً)

عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قرآن مہینے میں ایک بار ختم کر" میں نے کہا "میں اس سے زیادہ طاقت اپنے آپ میں پاتا ہوں"۔ آپ نے فرمایا: "اچھا تو پھر سات راتوں (یا دنوں) میں ختم کر اور اس سے زیادہ مت پڑھ۔"

(۳) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَا تُوَاصِلُوا" قَالُوا: "إِنَّكَ تُوَاصِلُ" قَالَ: "لَسْتُ كَأَحَدٍ مِنْكُمْ إِنِّي أُطْعَمُ وَأُسْقَى"

(بخاری، کتاب الصیام، باب الوصال)

حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "وصلی روزہ نہ رکھا کرو۔" لوگوں نے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ آپ تو وصل کرتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی بھی میرے جیسا نہیں۔ میں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) کھلایا اور پلایا جاتا ہوں"۔

(۴) عن أَبِي الْعَبَّاسِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنِّي

حضرت ابوالعباس بن صائب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے سنا جو کہتے تھے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا

أُخْبِرْ أَنَّكَ تَقُوْمُ اللَّيْلَ وَ تَصُوْمُ النَّهَارَ" قُلْتُ إِنِّي أَفْعَلُ ذٰلِكَ " قَالَ: فَإِنَّكَ إِذَا فَعَلْتَ هَجَمَتْ عَيْنُكَ وَ نَفِهَتْ نَفْسُكَ وَ إِنَّ لِنَفْسِكَ حَقًّا وَ لِأَهْلِكَ حَقًّا فَصُمْ وَ أَفْطِرْ وَقُمْ وَ نَمْ۔

(بخاری، کتاب التہجد)

"مجھے خبر ملی ہے کہ تُو ساری رات عبادت کرتا اور دن کو روزہ رکھتا ہے۔" میں نے کہا: "ہاں! میں ایسا کرتا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "اگر تو ایسا کرے گا، تو تیری آنکھیں بیٹھ جائیں گی اور تیری جان کمزور ہو جائے گی اور تُو یہ سمجھ لے کہ تیری جان کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔ روزہ رکھ بھی اور افطار بھی کر اور رات کو قیام کر بھی اور سو بھی۔

مندرجہ بالا احادیث سے درج ذیل نتائج نکلتے ہیں:

۱۔ نفلی روزوں کی زیادہ سے زیادہ حد یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھا جائے اور دوسرے دن نہ رکھا جائے۔ بعض دوسری صحیح احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس نے متواتر نفلی روزے رکھے، اس کا نہ روزہ ہے نہ افطار۔ یعنی اُسے ثواب ملنا تو درکنار، الٹا آپ کے حکم کے خلاف عمل کا مرتکب ہوگا۔

۲۔ وصلی روزہ (یعنی متواتر بلا روزہ کھولے کئی دن کا روزہ رکھنا) صرف حضور اکرم ﷺ کے لئے روا تھا امت کو آپ نے وصلی روزہ سے منع فرمایا۔ اس کی مثال بالکل وہی ہے کہ نمازِ تہجد آپ پر فرض تھی، مگر امت پر فرض نہیں اور یہ باتیں خصائص انبیاء سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک دوسری حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ اجازت، جو آپ نے دی وہ یہ ہے کہ شام کو اگر چاہے تو نہ کھائے مگر سحری ضرور کھائے اور یہ روزہ ۲۴ گھنٹے کا ہوگا۔ جیسا کہ ابتدائے اسلام میں روزہ کا دستور تھا۔ کہ وہ ۲۴ گھنٹے کا ہوتا تھا۔ بعد میں آسانی پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس میں تخفیف کر کے روزہ طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک قرار دیا

۳۔ مرفوع احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن سات دن یا رات سے پہلے ختم نہ کرنا چاہیئے اور رسول اللہ ﷺ سے یہ بات حکماً ثابت ہے۔ اسی بنا پر قرآن کی سات منازل مقرر کی گئیں کہ ہر روز ایک منزل پڑھ لی جائے۔ تاہم بعض صحابہ یا تابعین سے تین دن یا پانچ دن میں بھی ختم کرنا منقول ہے۔ جیسا کہ امام بخاریؒ نے ذکر کر دیا۔ پھر بھی ترجیح سات دنوں میں ختم کرنے کو دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرفوع احادیث کے مقابلہ میں صحابہ یا تابعین کے اقوال حجت نہیں ہیں اور اس کی بے شمار مثالیں احادیث میں مذکور ہیں۔ اسی بنا پر علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ تین دن سے پہلے قرآن ختم کرنا حرام ہے (بخاری، حوالہ مذکور۔ حاشیہ از وحید الزمان) پھر بعض روایات ایسی بھی ملتی ہیں کہ بعض صحابہ یا تابعین نے ایک دن میں قرآن ختم کیا، تو اس کی دو ہی توجیہات ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ

وہ روایت بذاتِ خود ضعیف ہو، دوسرے یہ کہ ان حضرات تک یہ مرفوع اور متصل احادیث نہ پہنچی ہوں اور یہی دوسری توجیہہ زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کسی صحابی کو رسول اللہ ﷺ کی صحیح مرفوع حدیث مل جائے اور وہ اس کا خلاف کرے۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جو نفلی عبادات کے سلسلہ میں بہت زیادہ حریص اور اپنے میں ان نفلی عبادات کے لئے بہت قوت پاتے تھے انہیں بھی زیادہ سے زیادہ یہی اجازت ملی کہ (۱) قرآن سات دن یا رات میں ختم کریں۔ (۲) روزہ ایک دن چھوڑ کر رکھ سکتے ہیں۔ (۳) وصلی روزہ کی کوئی اجازت نہیں۔ پھر عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو اپنی اس نفلی عبادت میں زیادتی کے اصرار کے باوجود بعد میں پچھتانا پڑا۔ اور فرمایا کرتے تھے۔ "کاش! میں رسول اللہ ﷺ کی رخصت کو قبول کر لیتا۔

۵۔ ساری رات کی شب بیداری خلافِ سنت ہے اور اس سے آپ نے سختی سے منع فرما دیا۔ کیونکہ اس سے ایک تو جسم و جان کمزور پڑ جاتے ہیں اور یہ نفس پر ظلم ہے۔ دوسرے انسان اپنی بیوی کے حقوق ادا نہیں کر سکتا اور یہ اس پر ظلم ہے اور یہی شکایت لے کر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے والد رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے تھے۔

ہم اب ان واضح احکامات کی روشنی میں اولیاء اللہ کی زندگی پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ وہ کس طرح کے متبع سنت ہیں اور اس کے لیے بنیادی ہم "تاریخ مشائخ چشت، از مولانا زکریا صاحب" کو بنائیں گے، کیونکہ آپ کم از کم شیخ الحدیث تو ہیں۔ گو ضمناً بعض دوسرے اولیاء کا ذکر بھی آجائے گا۔

اولیاء اللہ کے خلافِ شرع کام

۱۔ وصلی روزہ

۱۔ خواجہ عبدالواحد بن زید (م ۱۷۰ھ) تین دن کے بعد روزہ افطار کرتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۲۲) ۲۔ خواجہ فضیل بن عیاض (م ۱۸۷ھ) آپ پانچ دن کا وصلی روزہ رکھتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۱) ۳۔ خواجہ حذیفہ المرعشی (م ۲۰۲ھ) آپ چھ دن کا وصلی روزہ رکھتے تھے (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۴۹) ۴۔ خواجہ ابو اسحاق (م ۲۲۹ھ) آپ سات دن کا وصلی روزہ رکھتے تھے (ص ۱۵۳)

دیکھا آپ نے کس طرح یہ اولیاء اللہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس سنت کی خلاف ورزی میں بتدریج آگے بڑھ رہے ہیں، حتیٰ کہ پیرانِ پیر (۵) کا زمانہ آیا، تو آپ چالیس دن کا روزہ رکھتے تھے اور چالیس روز کے بعد جنگل کے پتوں اور اشیائے مباح بیابانی سے روزہ افطار فرمایا کرتے تھے۔ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۶۴)

۲۔ متواتر روزے

خواجہ فضیل بن عیاض (م ۱۸۷ھ) آپ ایک نوہ دن کے بعد روزہ افطار فرماتے دوسرے صائم الدھر تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۱) ۲۔ علو ممشاد دینوری (م ۲۹۸ھ)

آپ مادر زاد ولی اور صائم الدھر تھے۔ آپ نے بچپن میں بھی کبھی ماں کا دُودھ نہ پیا تھا۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۴۹)

۳۔ خواجہ محمد بن ابی احمد (م ۴۱۱ھ) آپ مادر زاد ولی تھے۔ پیدا ہوتے ہی کلمہ پڑھا۔ ۱۲ سال حجرہ میں تنہا رہے ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۵۵) ۴۔ خواجہ سعید ابو یوسف (م ۴۵۹ھ) آپ ایک مرتبہ عبادت میں کچھ کاہل ہو گئے تھے، تو بیس برس تک پانی نہ پیا۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۵۸)

۳۔ ساری رات جاگنا

۱۔ سری سقطی (م ۲۵۰ھ) آپ نے پورے ۹۸ سال زمین پر پہلو نہیں رکھا۔ سوائے بیماری اور مرض الموت کے۔ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۳۲) ۲۔ جنید بغدادی (م ۲۹۸ھ) آپنے کامل تیس سال عشاء کی نماز پڑھ کر اور ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر اللہ اللہ کی ہے۔ (صوفیائے نقشبند ص۹۰)

۳۔ خواجہ ابو احمد ابدال چشتی (م ۳۵۵ھ) آپ بیس برس تک بستر پر نہیں سوئے۔ قطب ابدال تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۵۵) ۴۔ پیرانِ پیر (م ۵۶۱ھ) آپنے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی۔ (خزینۃ الاصفیاء ص ۱۶۴) ۵۔ معین الدین چشتی اجمیری (م ۶۳۲ھ) حضرت کثیر المجاہدہ تھے، ستر برس رات کو نہیں سوئے۔ (تاریخ مشائخ چشت ص۱۵۵)

۴۔ قرآن خوانی

۱۔ ابو ہبیرہ بصری (م ۲۸۷ھ) آپ روزانہ دو کلام مجید ختم فرمایا کرتے تھے۔ (ایضاً ص ۱۴۷)
۲۔ خواجہ ابو احمد ابدالی چشتی (م ۳۵۵ھ) آپ کی عادت ایک قرآن دن میں اور دو قرآن شب میں ختم کرنے کی تھی (ایضاً ص ۱۵۵) (یعنی تین قرآن روزانہ) ۳۔ ابو یوسف بن سمعان (م ۴۵۹ھ) آپنے سورہ فاتحہ سو دفعہ پڑھی قرآن حفظ ہو گیا۔ آپ روزانہ پانچ قرآن ختم کرتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چست، ۱۶۰) ۴۔ پیرانِ پیر (م ۵۶۱ھ) آپ پندرہ سال تک نمازِ عشاء کے بعد طلوعِ صبح سے پہلے ایک قرآن شریف ختم کرتے تھے اور آپ میں دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپنے ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر یہ قرآن شریف ختم کئے (خزینۃ الاصفیاء ص ۱۶۴) ۵۔ کشف المحجوب میں علی ہجویری فرماتے ہیں۔ میں نے ابُو العباس عطاء سے پوچھا۔ آپ ہر روز کتنا قرآن پڑھ لیتے ہیں تو فرمایا: "اس سے قبل رات دن میں دو مرتبہ قرآن ختم کیا کرتا تھا۔ مگر اب چودہ سال ہو گئے کہ ابھی تک سورۃ انفال تک پہنچا ہوں۔" (ریاض السالکین، ص ۲۸۰)

بہ بین تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا

ہم نے بغرضِ اختصار صرف چار پانچ مثالیں قرونِ اولیٰ کے اولیاء اللہ سے پیش کر دی ہیں۔ اب ان کے عمل اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا موازنہ آپ خود فرمالیجئے۔

نکاح مسنون اور اس کی اہمیت

اسلام جن عائلی بنیادوں پر معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے اُن میں نکاح کو بہت اہمیت حاصل ہے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ — نکاح میری سنت ہے۔ جس نے میری سنت سے منہ موڑا، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ "اگر کوئی مستحق نکاح کی قدرت نہیں رکھتا، تو اسے چاہئے کہ روزے رکھے۔ تاکہ اس کی شہوت قابو میں رہے اور وہ حرام کاری کی طرف مائل نہ ہو۔ بس یہی ایک جائز صورت ہے۔ حرام کاری کو قابلِ حد جرم قرار دیا گیا اور اس کے تمام چور دروازے بھی بند کر دیئے گئے۔

نکاح سے گریز اب دیکھئے کہ صوفیاء کا بیشتر طبقہ نکاح سے گریز کرتا اور اس کو اپنی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا ہے۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ علی ہجویری جیسے بزرگ نے زندگی بھر نکاح نہیں کیا آپ نے اپنی آپ بیتی میں اعتراف فرمایا کہ "ایک مرتبہ کسی کی تیر نگاہ سے بسمل ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ بے تاب رہے، لیکن آخر کار فضلِ ایزدی نے زخم کا مرہم پیدا کر دیا۔" (خلاصہ تصوفِ اسلام، ص ۱۰)

اسی طرح خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے زندگی بھر نکاح نہیں کیا اور یہ داستان بھی عجیب ہے۔ صاحب حدیقۃ الاولیاء فرماتے ہیں:

"یہ مہربانی کا کلام سُن کر سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء (اپنے پیر فرید الدین گنج شکر) کی تعظیم کو اٹھے، چونکہ پاجامہ آپ کا اس وقت پھٹا ہوا تھا۔ حضرت (فرید الدین) نے اپنا پاجامہ منگوا کر ارشاد کیا کہ پہن لے سلطان المشائخ نے اپنے پاجامہ کے اوپر اس کو پہن لیا، جب ازار بند باندھنے لگے، تو مارے جلدی کے ازار بند ہاتھ سے چھوٹ کر پاجامہ پاؤں پر گر پڑا۔ حضرت نے فرمایا کہ ازار بند مضبوط کر کے باندھ لے۔ عرض کی کہ "کس قدر مضبوط باندھوں؟" فرمایا: "اس قدر کہ سوائے روزِ قیامت کے نہ کھلے اور اگر کھلے تو حورانِ بہشت پر کھلے۔" عرض کی کہ "بہتر ہے۔" اس روز سے سلطان المشائخ نے ارادہ نکاح فسخ کیا اور تمام عمر مجرد رہے۔ (حدیقۃ الاولیاء، ص ۴۴)

سو یہ ہے مرید اور مرشد دونوں کی سنتِ رسول ﷺ سے محبت اور اتباع کا نمونہ۔

ایک اور بزرگ شیخ شاہ محمد مشہور بہ مُلّا شاہ قادری ہیں جنہوں نے عمر بھر نکاح نہیں کیا۔ فرمایا کرتے تھے۔ "عمر بھر ہم کو غسلِ جنابت اور احتلام کی حاجت نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ دونوں غسل نکاح اور نیند سے متعلق ہیں اور ہم

نے نہ تو نکاح کیا اور نہ سوئے ہیں۔" (حدیقۃ الاولیاء، ص ۵۷)

پھر صرف یہی نہیں کہ خود نکاح نہیں کرتے بلکہ اس کو بُرا سمجھتے اور اس سے روکتے بھی ہیں:

نکاح ایک عہدو پیمان کا نام ہے

نکاح ایک عقد یا عہد و پیمان ہے۔ نکاح کی مجلس میں میاں بیوی اس عہد و پیمان کو نباہنے کے لئے گواہوں کے سامنے اقرار کرتے ہیں اور اس عہد و پیمان کو بخیر و خوبی نباہنے سے ہی اسلام کے تجویز کردہ عائلی نظام کے مقاصد پورے ہو سکتے ہیں مگر ان بزرگوں میں سے اگر کچھ حضرات نکاح کرتے بھی ہیں، تو اسے ایک کھیل تماشا بنا کے رکھ دیتے ہیں۔ درج ذیل واقعات ملاحظہ فرمائیے:

عبداللہ خفیف کا نکاح اور طلاق

(حضرت عبداللہ خفیف کا ذکر ہو رہا ہے) "نقل ہے کہ ایک بار آپ نے اپنے غلام سے کہا "مجھے نکاح کی حاجت ہے کوئی نیک عورت لاؤ، تا کہ نکاح کروں۔" خادم نے حکم کی تعمیل کی اور آپ نے نکاح کیا۔ آپ کو خدا نے ایک خوب صورت لڑکا عطا کیا۔ کچھ مدت کے بعد لڑکا فوت ہو گیا، آپ نے بیوی سے فرمایا۔ اب چاہو تو طلاق لے لو۔ اگر رہنا چاہو تو مجھے ضرورت نہ ہو گی۔ بیوی نے سبب پوچھا، تو فرمایا: "میں نے خواب دیکھا تھا کہ قیامت قائم ہے۔ بے شمار مخلوق غرقِ گناہ ہے۔ ناگاہ ایک لڑکا آیا اور اس نے ہجوم میں سے اپنے ماں باپ کو پکڑا اور پل صراط سے گزر کر بہشت میں لے گیا۔ پس میں نے سمجھا کہ اس معصوم کی شفاعت سے اس کے ماں باپ بخشے گئے۔ اس سبب سے میں نے نکاح کیا تھا۔ (مقربانِ حق، ص ۱۶۰)

اب یہ ملاحظہ فرمائیے کہ یہ بزرگ کس جرم میں اس عورت کو طلاق دینے یا اس سے ترکِ تعلق پر آمادہ ہو گئے۔ کیا قرآنی ارشاد وَ اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ کا یہی مطلب ہے؟

گویا آپ کو ایک معصوم بیٹے کی شفاعت مطلوب تھی، جب یہ مطلب حاصل ہو گیا، تو رسول اللہ کے اس ارشاد اِنَّ اَبۡغَضَ الۡحَلَالِ عِنۡدَ اللّٰہِ الطَّلَاقُ کی بھی چنداں پروا نہ کی۔

ابو محمد مرتعش کا نکاح اور طلاق

اب ایک دوسرے بزرگ ابو محمد مرتعش کا معاشقہ، نکاح اور پھر اس سے فرار کا قصہ سنیئے:

"نقل ہے کہ آپ نے بغداد کی کسی گلی میں گزرتے ہوئے دروازے پر کھڑے ہو کر پانی مانگا۔ ایک لڑکی پانی لائی، تو آپ اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد صاحب خانہ آیا اور دریافت کیا

کہ کیوں بیٹھے ہو؟" آپ نے فرمایا: "تیرے گھر سے ایک لڑکی پانی پلا کر میرا دل لے گئی۔" صاحب خانہ سمجھدار اور نیک آدمی تھا، آپ کو جانتا تھا، کہنے لگا: "وہ میری ہی لڑکی ہے اگر آپ چاہیں، تو نکاح کر دوں۔" فرمایا: "یہ نہایت مہربانی ہو گی۔" اس نے نوکروں کو حکم دیا کہ آپ کے بوسیدہ کپڑے اتار کر نہلائیں اور اچھی پوشاک پہنائیں پھر قاضی کو بلایا اور نکاح کر دیا، جب آپ دلہن کے خلوت کدے میں پہنچے، نوا دائے شکر کے طور پر پہلے نماز میں مشغول ہوئے۔ یکایک آپ نے شور مچا دیا کہ "میری گدڑی لاؤ، میری گدڑی لاؤ اور اپنی پوشاک لے لو۔" غرض آپ نے وہ ریشمی لباس اتار پھینکا اور اپنی گدڑی پہن لی اور عورت کو طلاق کہہ کر بھاگ نکلے۔ لوگوں نے پوچھا: "کیا معاملہ ہوا؟" فرمایا: "جب میں نے نماز شروع کی، تو میرے سر میں ندا آئی کہ ایک نظر کے بدلے، جو تو نے ہمارے مخالف پر کی، ہم نے تیرے بدن سے اپنے دوستوں کا ظاہری لباس (گدڑی) اتروا لیا۔ یاد رکھ! اگر تو نے دوسری نظر ڈالی، تو تیرے باطن سے بھی اپنی دوستی کا لباس اتار لیں گے۔" پس میں ڈر گیا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔" (مقربان حق، ص ۲۰۶)

اب اس بزرگ کے واقعہ سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ نکاح مانگنے کا طریق یہ ہے کہ جو لڑکی اچھی لگے۔ اس کے مکان کے سامنے دھرنا مار کے بیٹھ جاؤ۔

۲۔ اگر عورت کو بغیر خلوت طلاق کی ضرورت پیش آئے تو بھی نصف حق مہر جس کی ادائیگی (جس کا قرآن نے حکم دیا ہے) کی ضرورت نہیں۔ شاید نکاح بھی بغیر حق مہر کے تعین کے ہوا ہو۔

۳۔ بیوی پر نظر ڈالنا بھی غیر اللہ پر نظر ڈالنا ہے جس کی سزا بڑی سخت ملتی ہے۔ یہ ہے ان بزرگوں کی اتباع سنت کا نمونہ اور جو حضور ﷺ نے اتنے نکاح کئے تھے۔ اس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟

قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۲۶ھ) کے طلاق دینے کی وجہ

آپ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رئیس نامی نے خواب میں ایک عظیم الشان قبہ دیکھا جس کے گرد خلق کا ہجوم تھا اور ایک ٹھگنا شخص بار بار اس قبہ میں آمد و رفت کر رہا ہے، اور خلق جو اپنے پیغام دیتی ہے، قبہ میں جا کر ان کے پیغام پہنچاتا اور جواب لا کر سناتا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس قبہ میں رسول اللہ ﷺ ہیں اور یہ ٹھگنا شخص حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ میں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیجئے کہ میں آپ کے دیدار سے مشرف ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ گئے اور باہر آکر مجھے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں

کہ: "ابھی تجھ میں میرے دیکھنے کی قابلیت نہیں ہوئی۔ البتہ تو بختیار کاکی کے پاس جا کر میرا سلام پہنچا اور کہہ کہ تیرا بھیجا ہوا تحفہ مجھے پہنچتا تھا مگر تین روز سے یہ تحفہ نہیں پہنچا، اس کی کیا وجہ ہے؟" رئیس کہتا ہے جب میں بیدار ہوا، تو بختیار کاکی کے پاس جا کر سلام بھی پہنچایا اور پیغام بھی دیا۔ شیخ قطب الدین نے اسی وقت اپنی بیوی کو جس سے ابھی ابھی نکاح ہوا، طلب کیا اور مقررہ حق مہر اس کے حوالے کر کے طلاق دے دی بعد ازاں فرمایا کہ: "بیشک میں تین راتوں سے تزویج میں مشغول تھا اور یہ تزویج کا شغل رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تحفہ پیش کرنے سے مانع تھا اور وہ تحفہ یہ تھا کہ آپ تین ہزار مرتبہ درود شریف پڑھ کر سویا کرتے تھے۔" (سیر الاولیاء، ص ۵۶)

غور فرمایا آپ نے! رسول اللہ ﷺ کو تحفہ بھیجنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ یہ صحیح طریقہ بیوی کو طلاق دینے کے بعد ہی ہاتھ آسکتا ہے۔ پھر صاحب سیر الاولیاء کا کمال یہ ہے کہ اُس نے ایسا لاجواب قصہ تراشا کہ اسے تحفہ کے نام پر رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے اس بلا وجہ طلاق کے استحباب کا سامان بھی مہیا کر دیا اور بختیار کاکی کے اس صریح خلاف سنت اجتہاد کو مستحسن قرار دیا۔ تاہم اس قصہ میں ایک خوبی بھی ہے اور وہ یہ کہ ایسے قصے نکاح و طلاق کے سلسلہ میں ان اولیاء اللہ کے ذہن کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

البتہ اگر کرامت تراش کر یہ حساب لگا لیتا کہ تین ہزار مرتبہ درود پڑھنے پر کم از کم کتنا وقت لگتا ہے تو یقیناً وہ تعداد کم لکھتا۔

شیخ اکبر کا فلسفہ نکاح

اب ایک بہت جلیل القدر بزرگ محی الدین ابن عربی ہیں، جو ان صوفیاء کے شیخ اکبر ہیں۔ وہ دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ مشاہدہ حق ہوتا ہی اس وقت ہے جب انسان عورت سے جماع کرتا ہے۔ اپنی عورت سے ہو یا غیر سے۔ وہ اپنی دو سالہ عمر کی بچی سے بھی نکاح کا مسئلہ پوچھ سکتے ہیں اور (حلال و حرام کی تمیز سے بے نیاز۔ اس کی تفصیل ہم عشق و مستی، (باب صوفیاء کے مخصوص مسائل) میں ذکر کر آئے ہیں اور ان کے خوشہ چیں عفیف الدین تلمسانی نے ایسا فتوٰی بھی دے دیا تھا۔

اتباع سنت کن باتوں میں؟

صوفیاء کی ان سب باتوں کے باوجود ہمیں یہ تسلیم کرنے میں باک نہیں کہ ان بزرگ ہستیوں کو بھی بعض دفعہ شریعت کی پاسداری اور اتباع سنت کا خیال آ ہی جاتا ہے اب جس طرح کی باتوں کا انہیں خیال آتا ہے وہ بھی چند مثالیں حاضر خدمت ہیں:

۱۔ اویس قرنیؒ کا دانت توڑنا

آپ کے متعلق یہ قصہ زبانِ زدہے کہ آپ نے اپنے سارے دانت محض اس خیال سے شہید کر ڈالے تھے کہ معلوم نہیں کہ جنگِ اُحد میں رسول اللہ ﷺ کے کون سے دو دانت شہید ہوئے تھے۔ اور یہ خواجہ صاحب کی رسول اللہ ﷺ سے محبت کا تقاضا تھا۔ غور فرمائیے! کیا سارے کے سارے دانت توڑنے سے واقعی اتباعِ سُنت ہو گئی تھی؟

۲۔ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) اور والدین کا حق

"بچپن میں آپ مکتب میں پڑھتے تھے جب اس آیت پر پہنچے اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ یعنی "شکر کر میرا اور اپنے والدین کا۔" گھر آ کر والدہ سے کہنے لگے کہ میں نے قرآن میں سبق پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "شکر کر میرا اور اپنے والدین کا۔ تو اب میری عرض یہ ہے کہ میں دو گھروں سے تعلق نہیں نباہ سکتا یا تو مجھے آپ خُدا سے مانگ لیجئے کہ بالکل آپ ہی کا ہو رہوں یا خُدا کو سونپ دیجئے کہ بالکل اسی کا بن جاؤں۔" والدہ نے فرمایا: "میں نے تمہیں اپنا حق بخش دیا۔ یہ سُن کر آپ بسطام سے نکلے اور تیس سال تک شام کے جنگلوں میں ریاضت مجاہدہ کرتے رہے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۸۶)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ اللہ کا شکر اور والدین کا شکر، دونوں احکام کی بجا آوری، اولیاء اللہ کی بساط سے باہر ہے کیونکہ قرآن کے احکام عام لوگوں کے لیئے ہیں۔

۲۔ والدہ کی اجازت لے لیں، تو والدہ کا حق از خود ادا ہو جاتا ہے۔

۳۔ اللہ کا شکر جنگلوں میں جا کر ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ معین الدین چشتی اور انگلیوں کا خلال

ایک بار آپ وضو میں انگلیوں کا خلال کرنا بھول گئے تو غیب سے آواز آئی کہ "محبتِ رسول کا دعوےٰ اور سنّت کا ترک؟" آپ نے فوراً توبہ کی کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۶۷)

آپ جب علی ہجویری کی قبر پر چلّہ کشی فرما رہے تھے، تو اس وقت آپ کو سُنتِ رسول یاد نہیں آئی۔ پھر ستر برس تک رات بھر سوتے بھی نہیں۔ اس وقت بھی سنتِ رسول یاد نہ آئی۔ انگلیوں کا خلال شاید ان باتوں سے بڑھ کر ہو۔

۴۔ جلال الدین عمری (م ۹۸۰ھ)

آپ کی مرض الموت میں آپ کو کھانے کی دوا دی گئی۔ صاحبِ فراش تھے۔ خادموں سے فرمایا۔ مجھے پہنچے

بٹھلادو۔ جب بیٹھ گئے، اس وقت دوا نوش فرمائی اور فرمایا: "نبی اکرم ﷺ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے تختِ سریر پر بیٹھ کر کوئی چیز کھاتی ہو۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۲۱۰)

۵۔ میاں جی نور محمد (م ۱۲۵۹ھ)

حضرت میاں جی صاحب کا مزار خام ہے۔ البتہ اس کا حلقہ پختہ ہے۔ بعض لوگوں نے چاہا کہ اس کو ایک ہاتھ سے اونچا کر دیں، مگر آپ نے کسی کو خواب میں ارشاد فرمایا: "یہ خلافِ سنت ہے۔ ایسا نہ کرو۔ ایک ہی ہاتھ اونچا رہنے دو۔" (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۲۳۶)

یہ وہی میاں جی صاحب ہیں جنہوں نے فرمایا کہ فقیر نہیں مرتا۔ اس کی قبر سے وہی فائدہ ہوگا، جو ظاہری زندگی میں ہوتا تھا۔ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۲۳۴)

۶۔ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) کا تقویٰ

ایک روز آپ نے صحرا میں اپنا کپڑا دھویا۔ ایک ارادتمند ساتھ تھا، وہ بولا: ہم اس کو انگوروں کی دیوار پر لٹکا دیتے ہیں۔ فرمایا: "لوگوں کی دیوار میں میخ نہ لگاؤ۔" مرید نے کہا: "درخت پر لٹکا دیتے ہیں۔" فرمایا: "ایسا نہ کرنا۔ درخت کی شاخیں ٹوٹ جائیں گی۔" عرض کیا: "گھاس پر پھیلا دیتے ہیں۔" فرمایا: "ایسا نہ کرنا، گھاس چارپایوں کا چارہ ہے۔ ہم کپڑے سے اس کو نہیں چھپاتے۔" پس آپ کپڑے کو پشتِ مبارک پر رکھ کر دھوپ میں کھڑے ہو گئے۔ جب ایک طرف سوکھ گئی تو دوسری طرف الٹ دی۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۹۲)

دیکھ لیا آپ نے تقویٰ کسے کہتے ہیں۔ اگر بایزید جیسے بزرگ کے علاوہ آپ کے سامنے کوئی اور شخص ہوتا تو آپ ایسے سوال و جواب پر اُسے یقیناً دیوانہ کہتے۔ نہ تو انگوروں کی دیوار میں میخ لگانے کی ضرورت تھی۔ نہ ہی کپڑا ڈالنے سے درخت کی شاخیں ٹوٹتی ہیں اور نہ ہی اس چند فٹ کی جگہ پر کوئی مویشی چرنے آ گئے تھے۔ بہرحال یہ مرید و مرشد کی اسرار و رموز کی مقدس باتیں ہیں۔ ہم اور آپ انہیں کیا جانیں۔ یا پھر یہ تذکرہ نگاروں کی پرواز تخیل ہے۔

۷۔ خواجہ امیر کلال (م ۷۷۲ء) کا تقویٰ

خواجہ صاحب نے بھی بالکل اسی طرح کپڑے سکھائے تھے اور ساتھ ہی اس کی وجہ یوں بیان فرمائی کہ اگر باڑ کو نقصان پہنچ جائے یا شاخیں ٹوٹ جائیں یا مویشیوں کی گھاس خراب ہو جائے، تو باغ کے مالک کو کیا جواب دو گے، دوسروں کی ملکیت میں تصرف کرنا خلافِ شرع ہے۔ گناہ صغیرہ کو معمولی اور آسان نہیں سمجھنا چاہیئے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۵۹)

۵۔ جنّت اور دوزخ کا استہزاء

دینِ اسلام کی تیسری نظریاتی بنیاد آخرت میں اپنے اعمال کی جزا و سزا کا عقیدہ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (۶۶/۶) — اے ایمان والو! اپنے آپ کو اپنے اہل وعیال کو آتشِ جہنم سے بچاؤ۔

نیز یہ بھی فرمایا :

سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ (۲۱/۵۷) — اپنے پروردگار کی بخشش اور جنت کی طرف لپکو۔

اور حضورِ اکرم ﷺ نے اپنی مکہ کی تیرہ سالہ زندگی اسی جزاء و سزا کے عقیدہ اور جنت اور دوزخ کے اوصاف بیان کرنے میں گزار دی، چنانچہ مکّی سورتوں میں جنت اور دوزخ کا یہ تصوّر نمایاں طور پر پایا جاتا ہے اور اس عقیدہ کو کئی انداز سے ذہن نشین کرایا گیا ہے اور حقیقت میں یہی عقیدہ انسان کی عملی زندگی کی جان ہے لیکن ابن عربی نے وحدتُ الوجود کا نظریہ پیش کر کے اس قدر کو بھی بدل ڈالا۔ جب سب چیزیں اللہ کا حصہ اور اس کی عین قرار پائیں، تو پھر بھلا وہ کون سا الٰہ ہے، جو اپنے آپ کو جہنم کے سپرد کر دے گا۔ اس نظریہ سے خیر و شر کی کوئی تمیز باقی نہ رہی۔ جزا و سزا اور جنت و دوزخ بے معنی چیزیں بن گئیں۔ اللہ تعالےٰ تو یہ فرماتے ہیں کہ :

"اللہ نے مسلمانوں سے اُن کی جانیں اور اموال خرید لئے ہیں اور اس کے عوض انہیں جنت عطا فرمائے گا" مگر یہ لوگ جنت کو خاطر میں ہی نہیں لاتے اور یہ نظریہ اتنا عام ہوا کہ عام لوگ بھی اس کے تاثرات سے نہ بچ سکے۔ کسی شاعر نے اس نظریہ کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے :

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے — او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

علو ممشاد دینوری (م ۲۹۸ھ) کی جنت سے بے نیازی

" آپ کے وصال کے وقت ایک بزرگ پاس بیٹھے تھے۔ وہ جنت کے ملنے کی دُعا کرنے لگے۔ حضرت ممشاد نے ہنس کر فرمایا: " تیس سال تک جنت اپنی ساری دلکشیوں سمیت میرے سامنے آتی رہی، مگر میں نے ایک مرتبہ بھی اُن کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھا۔ میں تو جنت کے مالک کا مشتاق ہوں۔"

(تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۱)

اب دیکھئے ! معراجِ نبوی کے دوران جنت آپ کو بھی دکھائی گئی تھی۔ پھر کیا آپ نے ایسی بے اعتنائی فرمائی تھی جیسا کہ ممشاد صاحب فرما رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو وفات کے وقت یوں فرمائیں کہ "اگر میں

برابر سراسر چھوٹ جاؤں تو غنیمت ہے۔" لیکن آپ پر تیس سال سے جنت اپنی پوری رعنائیوں سے پیش ہوتی رہی، لیکن آپ اسے خاطر میں ہی نہیں لاتے۔

دوزخ مقامِ لذت ہے

اب جنت اور دوزخ کی حقیقت اور اس کا فلسفہ مشہور متصوف عبدالکریم جیلی، جو ابنِ عربی کی کتاب فصوص الحکم کے شارح ہیں، کی زبان سے سنیئے، فرماتے ہیں:

"اور میں (یعنی عبدالکریم جیلی، مصنف انسانِ کامل) ایک مرتبہ افلاطون سے (کشف میں) ملا۔ جس کو اہلِ ظاہر (یعنی علمائے دین) کافر کہتے ہیں۔ میں نے ایسی حالت میں اس کو پایا کہ عالمِ غیبی نور اور بہجت (رونق) سے بھر گیا تھا۔ اور اس کا ایسا مرتبہ میں نے دیکھا کہ بعض کے سوا کسی ولی کو بھی یہ رتبہ نصیب نہیں ہوا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں قطبِ زمان اور اپنے وقت کا یکتا (یعنی فرد) ہوں ہم نے اس قسم کے تمہارے لئے بہت سے عجائب و غرائب دیکھے ہیں۔ جن کا ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس باب میں ہم نے تیرے لئے رمز کے طور پر بہت سے اسرار رکھے ہیں جس میں لسانِ رمز کے سوا کلام کرنے کی ہم کو گنجائش نہیں ہے۔ پس میرے کلام کے پوست کو پھینک دے اور اگر تو عقلمند ہے تو مغز کو لے لے۔ ان اوراق میں میں نے وہ علوم جمع کئے ہیں کہ دوزخیوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے کسی دوسری شے کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔" (انسانِ کامل، ص ۳۰۶)

پھر جو کچھ افلاطون نے مصنف کتاب انسانِ کامل عبدالکریم جیلی کو بطورِ رمز تبلایا، اس کا خلاصہ آپ نے ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے:

"دوزخیوں کو دوزخ میں لذت ہوگی۔ جیسے اس شخص کو لڑائی بھڑائی میں لذت آتی ہے، جو اس کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ہم نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ لڑائی بھڑائی میں لذت پاتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہوتے ہیں کہ وہ اس میں تکلیف پا رہے ہیں، لیکن وہ ربوبیت جو اُن کے نفس میں پوشیدہ ہے۔ ان امور میں خوض کرنے پر اُن کو آمادہ کرتی ہے۔ پھر اُن کے لئے ایک اور بھی لذت ہے، جو خارش والوں کی لذت کے مشابہ ہے کہ اگرچہ کھجلا کھجلا کر اُن کا بدن کٹ جاتا ہے اور چھل جاتا ہے، مگر وہ اس کے کھجلانے میں لذت پاتا ہے، اور وہ عذاب و لذت کے مابین ہوتا ہے۔ ...... پھر اُن کے لئے ایک مختلف لذت ہے۔ حتیٰ کہ میرا ایک جماعت سے (کشف میں) ملنے کا اتفاق ہوا، جو دوزخ کے سخت ترین عذاب میں تھے۔ اس حالت میں میں نے

اُن کو دیکھا کہ جنت اُن پر پیش کی جاتی تھی اور وہ اسے اچھا نہیں جانتے تھے ... پھر جاننا چاہیئے کہ دوزخیوں میں ایسے آدمی بھی ہیں جو اللہ کے نزدیک بہت سے جنتیوں کی نسبت اچھے ہیں۔ خدا تعالےٰ نے ان کو دار الشقاوۃ میں داخل کیا ہے تاکہ اس میں ان پر تجلی کرے اور (اشقیاء میں سے وہ شخص اس (یعنی خدا) کی نظر کا محل ہو اور یہ ایک عجیب و غریب امر و راز ہے یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ وَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ" (انسانِ کامل، ص ۳۰۰)

پھر اپنے فلسفہ کی تائید میں قرآن کریم کی آیت وَمَا تَشْتَھِیْہِ الْاَنْفُسُ سے ثبوت یُوں پیش فرماتے ہیں:

"کیا تو اس بات کی طرف خیال نہیں کرتا کہ جب تک وہ (آدم علیہ السلام) جنت میں تھے۔ جس چیز کا اپنے جی میں تصور کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ اُن کی حس میں اس کو پیدا کر دیتا تھا اور جو جنت میں داخل ہوگا۔ اس کے لئے بھی یہی ہوگا۔ اور جب عالم دنیوی میں وہ (آدمؑ علیہ السلام) نازل ہوئے تو یہ بات ان کے لئے نہ رہی۔ اس لئے کہ ان کی حیات مصوّرہ یعنی وہ زندگی کہ جس چیز کا وہ تصور کرتے تھے وہ موجود ہو جایا کرتی تھی۔ جنت میں بالذات تھی۔ اور اس دنیوی زندگی میں رُوح کے ساتھ کہ وہ اہلِ دنیا کے لئے مُردہ کا حکم رکھتی ہے مگر اس شخص کی رُوح جس کو حیاتِ ابدیہ سے خدا تعالیٰ نے زندہ فرمایا اور اسے اس نظر سے دیکھا جس نظر سے اپنی ذات کو دیکھا۔ اور اپنے اسماء وصفات سے اسے متحقق کیا۔ پس ایسے شخص کو (یعنی اس گروہ صوفیاء میں سے اکثر کو۔ مؤلف) دنیا میں قدرت حاصل ہوتی ہے، جو اہلِ جنت کو دار الآخرت میں حاصل ہوگی۔ وہ جس کا تصوّر اپنے جی میں کرتا ہے۔ خدا تعالےٰ اس کی حس میں اس کو پیدا کر دیتا ہے۔" (انسان کامل، ص ۳۱۴)

یہ تو خیر ان لوگوں کا دوزخ کو لذت کا مقام ثابت کرنے کا فلسفہ تھا۔ اب جس طرح ان لوگوں نے مذاق اڑایا ہے یہ داستان بھی ملاحظہ فرمائیے، خواجہ حسن دہلوی راوی ہیں:

معروف کرخی کا جنت میں جانے سے انکار

"اسی اثنا میں اولیائے حق اور ان کے کمالِ محبت کا ذکر چلا۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا: کل قیامت کے دن حشر کے میدان میں معروف کرخی کو لایا جائے گا اور وہ یُوں نظر آئیں گے جیسے کوئی حد سے زیادہ مست ہو۔ خلقت انہیں دیکھ کر حیران ہو جائے گی اور پوچھے گی: "یہ کون ہیں؟" پھر وہ یہ آواز سُنے گی کہ یہ ہماری محبت میں مست ہے۔ اسے معروف کرخی کہتے ہیں۔ اس وقت معروف کرخی کو حکم ہوگا کہ بہشت میں چلو۔ وہ کہیں گے "میں نہیں جاتا۔ میں نے تیری بہشت کیلئے عبادت نہیں کی۔" بعد از ان فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ انہیں نُور کی زنجیروں میں جکڑ کر کھینچتے کھینچتے بہشت میں لے جاؤ۔" (فوائد الفواد۔ ملفوظات، حضرت

خواجہ نظام الدین اولیاء ۔ مرتبہ حسن دہلوی ، ترجمہ : پروفیسر محمد سرور ، ص ۲۵۳ ، طابع : علماء اکیڈیمی ، پنجاب بسلاہور)

اب ذرا حشر کے میدان کی دہشت ذہن میں لائیے ۔ جس دن حضور اکرم ﷺ کے سوا سب نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے ۔ اور حضور اکرم ﷺ اپنے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ " میں اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو سکوں گا ، جب تک کہ مجھے اللہ کی رحمت نہ ڈھانپ لے ۔" لیکن یہ بزرگ اس دہشت سے بالکل مامون اور مست ہوں گے اور جب خدا ان سے حساب کتاب لئے بغیر بہشت میں جانے کا آرڈر دے گا ، تو یہ اٹھکیلیاں کریں گے ، لیکن خدا کو انہیں جنت میں بھیجنے کی اتنی ضرورت ہوگی کہ دوبارہ فرشتوں کو حکم دے گا کہ " اسے " نور کی زنجیروں " سے جکڑ کر کھینچتے کھینچتے بہشت میں لے جاؤ ۔ یہ نور کی زنجیریں جیسا کہ اللہ کے اپنے نور کی ہوں گی ۔ آخر یہ بزرگ واصل باللہ جو تھے ۔ اور ان کی بزرگی کی شان یوں نمایاں کی جائے گی ۔ پہلے ایک آواز آئے گی : " یہ کون ہیں ؟ " پھر دوسری آواز جواب دے کر ان کا تعارف کرائے گی ۔

جنت کے خیال سے عبادت بھی جرم ہے

ابو بکر کلابازی اپنی کتاب التعرف لمذہب اہل التصوف کے ص ۱۵۵ پر ایک واقعہ درج کرتے ہیں ۔ (یہ واقعہ بہت سی کتابوں میں مذکور ہے)

" کچھ لوگ رابعہ بصری کی خدمت میں بیمار پرسی کے لئے حاضر ہوئے ۔ پوچھا کیا حال ہے ۔ رابعہ بصری نے جواب دیا : " واللہ ! مجھے اپنی بیماری کا کوئی سبب نظر نہیں آتا ۔ سوا اس کے کہ مجھ پر جنت پیش کی گئی اور میرا دل اس طرف مائل ہو گیا ۔ اس پر میرے آقا نے مجھ پر عتاب کیا ہے ۔

غور فرمائیے ! اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ " اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور اموال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں " اور یہ لوگ جنت کے تصور اور اس کی طرف میلان کو جرم قرار دیتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ جنت اور اس کی نعمتوں کو نزلا من غفور رحیم فرمائیں اور یہ لوگ اللہ کی اس مہمان نوازی کا یوں تمسخر اڑائیں ۔ فیا للعجب ۔

انہی رابعہ بصری نے ایک بار فرمایا : " اگر میں تیری عبادت بہشت کی چاہت میں کروں ، تو مجھے اس سے محروم رکھنا اور اگر تیرے دوزخ کے ڈر سے کروں ، تو مجھے اس میں جلانا اور اگر تیری عبادت صرف تیری محبت میں کروں ، تو مجھے اپنے جمال بے مثال سے محروم نہ رکھنا ۔ سبحان اللہ ! " (مقربان حق ، ص ۱۵)

یہ ہے ارشاد خداوندی وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (۷:۵۶) صحیح تاویل و تعبیر ۔

بایزید بسطامی کا ایک آہ سرد سے جہنم کو ٹھنڈا کر دینا

خواجہ معین الدین اجمیری کی زبان سے سنیئے :

" ایک بار خواجہ بایزید بسطامی مقام قرب میں تشریف لے گئے ۔ ہاتف نے آواز دی اے بایزید ! تمہاری خواستگاری اور ہماری بخشش و عطا کا وقت ہے مانگو

کیا مانگتے ہو، مَیں تم کو دوں گا۔ خواجہ نے سجدہ میں سر جھکایا اور کہا: "بندہ کو خواستگاری سے کیا کام؛ بادشاہ کی بخشش اور انعام و اکرام جس قدر ہو جائیں بندہ اسی میں راضی ہے"۔ پھر آواز آئی "ہم نے تجھ کو آخرت کی خوبی اور دستگاری عطا کی"۔ بایزید نے عرض کیا: "کہ الٰہی! آخرت تو دوستوں کا بندی خانہ ہے"۔ پھر آواز آئی: "اچھا ہم نے بہشت اور دوزخ اور عرش اور کرسی، جو کچھ ہماری مملکت ہے تم کو دی۔" عرض کیا: "نہیں!" پھر ندا آئی: "اچھا تمہارا کیا مطلب ہے؟ کچھ مانگو تو دیں"۔ عرض کیا: "الٰہی! جو میرا مطلب ہے وہ تو خود جانتا ہے۔" آواز آئی: "اے بایزید! تو ہم کو ہم سے مانگتا ہے۔ اگر ہم تجھ کو تجھ سے مانگیں، تو تُو کیا کرے گا؟ جیسے ہی یہ آواز آئی، خواجہ نے قسم کھا کر عرض کیا کہ "قسم ہے تیرے عزت و جلال کی۔ اگر تو مجھ کو کل قیامت میں طلب کرے گا اور آتشِ دوزخ کے سامنے کھڑا کرے گا تو حاضر ہوں گا اور کھڑا ہو کر ایسی سرد آہ کھینچوں گا کہ دوزخ کی حرارت زائل ہو جائے گی حتیٰ کہ کچھ نہ رہے گی۔ کیونکہ آتشِ محبت کے سامنے اس کی کیا اصل ہے۔ جب بایزید نے یہ فرمایا ندا آئی کہ "اے یزید! ہر چہ جستی یافتی" (یعنی جس چیز کی تجھ کو تلاش تھی پالی)

اس اقتباس سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ جس طرح حضورِ اکرم ﷺ کو معراج کے دن قربِ الٰہی حاصل ہوا تھا۔ اولیاء کے لئے ایسے بے شمار مواقع آتے رہتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کو تو خود اللہ تعالیٰ لے گیا تھا، لیکن یہ خود پہنچ جاتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کی گفتگو عبد اور معبود کے درمیان تھی۔ لیکن یہاں گفتگو اس انداز سے ہو رہی ہے جیسے

خدا کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں

جو خدا کی ساری مملکت لے کر بھی راضی نہیں ہوتے۔

۲ اللہ نے جو اتنی مدت سے جہنم تیار کر رکھا ہے وہ بس اُن کی ایک آہِ سرد کی مار ہے۔ بھلا اس آتشِ جہنم کو آتشِ محبت سے کیا نسبت؛ اگر خدا اس آگ میں پھینک بھی دے تو وہ ان کا کیا بگاڑ لے گی۔

۳ آخر خدا نے مجبوراً انہیں واصل باللہ (اپنے ساتھ ملانے کی) خواہش پوری کردی۔ اس کے بغیر چارہ بھی کیا تھا۔

یہ تو تھا ان بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کا جنت اور دوزخ سے متعلق تصور۔ رہی انسان کے اعمال کی جزاو سزا اور حساب کتاب کی بات، تو اس کو جس طرح ان اولیاء اللہ نے اپنے مریدوں سے وعدے کر کے نجاتِ اُخروی کی ضمانت دے رکھی ہے وہ ہم اولیاء اللہ کے تصرف میں بیان کر چکے ہیں۔

۶۔ ارکانِ اسلام کا استہزاء

دینِ اسلام کا سب سے اہم اور بنیادی عقیدہ توحید اور پھر اس کے بعد جزا و سزا کا عقیدہ ہے۔ دینِ طریقت نے جب بنیادی عقائد پر ہی ہاتھ صاف کیا تو ارکان و اعمال پر اس کا اثر مرتب ہونا لازمی تھا۔ بہت سے پیر ایسے تھے اور ہیں جن کے ہاں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور علی الاعلان بکواس کہتے، لوگوں کو گالیاں دیتے، فحاشی اور بعض کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ وہی جنت و دوزخ سے متعلق ان کا تصور ہے، جو وحدت الوجود کے عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ اب مشکل یہ آن پڑی کہ عام مسلمان، جاہل ہونے کے باوجود، قرآن، حضور اکرم ﷺ اور سنت سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کے لئے شریعت، طریقت اور معرفت و حقیقت کا عقیدہ تراشا گیا۔ شرعی اصطلاحات کے "باطنی معنیٰ" تراشے گئے۔ مثلاً عشق و محبت، ایمان" کے مترادف قرار پایا۔ گویا جس مذہب کے لوگ بھی اس طریقت کے راستے پر گامزن اور عشق و محبت خدا کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ سب "مومن" ٹھہرے اسی طرح "دین کے معنی" "تفرقہ کے مقام سے توحید کے مقام میں آنا" یہاں تفرقہ سے مراد کائنات کا ہر چیز کو الگ الگ سمجھنا ہے اور یہ سلوک کی پہلی منزل ہے اور توحید (وحدت الوجود) جو ان کی پانچویں منزل ہے اس مقام پر پہنچ کر آدمی دیندار ہوتا ہے۔ اسی طرح "نماز کے معنی، دل کا خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے۔" یہی وجہ ہے کہ اکثر یہ بزرگ اپنے آپ کو نماز وغیرہ کا مکلف قرار نہیں دیتے۔ ان کا دل، جو خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو گویا ہر وقت وہ نماز ہی ادا کر رہے ہوتے ہیں۔" حج اور زکوٰۃ کے معنی برائیوں کو ترک کر کے نیکیوں کو اختیار کرنا اور کعبہ کے معنی مقامِ وصل ہے۔ (مرشدِ کامل ترجمہ حدائق الاخیار، مصنفہ صادق فرغانی، ص ۳۴۸)

گویا اللہ تعالیٰ کے احکام، اسلام کے ارکان اور شعائر اللہ کا استہزاء واستخفاف ان کا شعار ٹھہرا۔ یہ لوگ نمازِ پنجگانہ کی تحقیر کرتے اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے شیخ کی دعا اس سے افضل و اعلیٰ ہے اور یہ عقیدہ شیعوں کے علاوہ سنیوں میں بھی موجود ہے۔ ان کا ایک گیت ملاحظہ ہو:

تَعَالُوا نُخَرِّبُ الْجَامِعَ وَنَجْعَلُ فِيهِ خَمَّارَهْ — آؤ ہم لوگ مسجد کو ویران کریں اور اس میں شراب کی دکان قائم کریں
وَنَكْسِرُ الْمِنْبَرَ وَنَجْعَلُ مِنْهُ طَنْبَارَهْ — اور منبر کو توڑ کر اس سے ساز و مزامیر بنائیں
وَنُخَرِّقُ الْمُصْحَفَ وَنَجْعَلُ مِنْهُ زَمَّارَهْ — اور قرآن کو پھاڑ کر اس کی بانسری بنائیں
وَنَنْتِفُ لِحْيَةَ الْقَاضِي وَنَجْعَلُ مِنْهُ أَوْتَارَهْ — اور قاضی کی داڑھی اکھاڑ کر اس کے تانت بنائیں۔ (تاریخ دعوت و عزیمت، ص ۱۹۳ از ابوالحسن علی ندوی)

حج بیت اللہ شریف

ان لوگوں کی تحقیر و تضحیک کا سب سے بڑا ہدف حج اور کعبہ ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ان کے آئمہ و شیوخ کی زیارت حج بیت اللہ سے افضل ہے یہی وجہ ہے کہ جو مناسک بیت اللہ شریف سے مخصوص ہیں مثلاً اس کے سامنے سجدہ ریز ہونا، اس کو چومنا۔۔۔ ۔۔۔ اس پر غلاف چڑھانا، غلاف پکڑ کر دعا کرنا۔ اس گھر کا طواف کرنا اور سعی وغیرہ، غرض یہ سب شعائر یہ لوگ اپنے بزرگوں کی قبروں پر بجا لاتے ہیں۔ حج کی طرح سال میں ایک بار سالانہ عرس کا دن مقرر کر کے اس کو حج کے مثل یا اس سے بہتر قرار دیتے ہیں۔ یہ "بزرگ" کعبہ کے متعلق عجب عجب خرافات بکتے ہیں، سب سے پہلے منصور حلاج نے یہ فتوے دیا کہ اگر کسی کا حج فوت ہو جائے، تو اپنے ہاں کعبہ بنا کر اس کا طواف کر سکتا ہے اور اس پر جتنی رقم خرچ ہو سکتی ہے، وہ صدقہ دے سکتا ہے۔ (مجموعۃ الرسائل الکبریٰ، امام ابن تیمیہؒ، ج ۲، ص ۹۷)

ابن عربی نے اپنا ایک واقعہ لکھا ہے کہ "کعبہ اپنی بنیادوں سے اٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ اس جرم میں کہ میں عارفین کے مقابلہ میں اس کی تحقیر کرتا ہوں۔ پھر میں نے اس کی تعریف شروع کی، تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ (یہ واقعہ تفصیل سے ہم پہلے درج کر آئے ہیں) ابن عربی بھی یہ فتویٰ دیتا تھا کہ حج پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ اس حج پر جتنا خرچ متوقع ہو صدقہ کر دینا چاہیئے۔ جبکہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا یعنی اللہ کا لوگوں پر یہ حق ہے کہ وہ اس کے گھر کا حج کریں، جو کوئی استطاعت رکھتا ہو۔ لیکن یہ بزرگ اس اللہ کے حق اور رکن اسلام کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا کہ بہت سے پیر لوگ حج کرنے نہیں جاتے۔ اس کی تہہ میں یہی فلسفہ کار فرما ہے کہ جس طرح کعبہ انوار الٰہی کا جائے نزول یا مہبط ہے۔ اسی طرح عارفین کا دل بھی انوار الٰہی کا مہبط یا جائے نزول ہے چنانچہ ان میں یہ مقولہ بھی بہت مشہور ہے:

دل بدست آور کہ حج اکبر است

اور اس کی اصل وجہ وہی ہے جو ان کے اکابر حلاج اور ابن عربی نے پیش کی ہے کہ ان عارفین کو کعبہ کا حج کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ کعبہ کو خود آ کر ان عارفین کا طواف کرنا چاہیئے۔ چنانچہ درج ذیل واقعہ خواجہ معین الدین چشتی سے منسوب ہے۔ آپ بایزید بسطامی کے متعلق ارشاد فرما رہے ہیں:

"پھر خواجہ بایزید نے اسی مقام پر فرمایا کہ "میں مدتوں خانہ کعبہ کا طواف کرتا رہا۔ جب مجھ کو قرب و حضوری عطا کی گئی اس وقت خود خانہ کعبہ نے میرے گرد طواف کیا۔" (ترجمہ دلیل العارفین، ملفوظات معین الدین چشتی، مرتبہ بختیار کاکی، ص ۹۹)

خانہ کعبہ کا رابعہ بصریہ کے طواف کو جانا

مزید براں کہ خانہ کعبہ خود بزرگوں کے گرد طواف کرنے کے لیئے چلا جاتا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی لکھتے ہیں کہ خواجہ عثمان ہارونی نے فرمایا کہ: "حتیٰ کہ (ابراہیم بن ادہم) چودہ برس کی مدت میں بلخ سے خانہ کعبہ تک پہنچے، تو اس مقام پر خانہ کعبہ کو نہ پایا۔ نہایت متحیر ہوتے۔ اس حال میں ہاتفِ غیبی نے آواز دی کہ: "اے ابراہیم! ٹھہرو اور صبر کرو۔ خانہ کعبہ ایک ضعیفہ کی زیارت کو گیا ہے۔ ابھی آیا چاہتا ہے۔ خواجہ یہ آواز سن کر متحیر ہوئے اور عرض کیا کہ" الٰہی! وہ ضعیفہ کون ہیں؟" حکم ہوا کہ جنگل میں ایک ضعیفہ ہیں۔ خواجہ علیہ الرحمتہ روانہ ہوتے۔ تاکہ ضعیفہ کی زیارت سے مشرف ہوں۔ جب جنگل میں پہنچے تو حضرت رابعہ بصری کو دیکھا اور دیکھا کہ خانہ کعبہ ان کے گرد طواف کر رہا ہے۔" (انیس الارواح، ص ۱۷، ملفوظات خواجہ عثمان ہارونی، مرتبہ: خواجہ معین الدین چشتی)

سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم بن اُدہم کا زمانہ دوسری صدی ہجری ہے۔ جبکہ بے شمار مسلمان شب و روز خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول رہتے تھے۔ اتنا اہم تاریخی واقعہ کسی نے کیوں ذکر نہ کیا۔ پھر حضرت رابعہ بصری پر ہی کیا موقوف ہے۔ دوسرے اس پایہ کے بزرگوں کے پاس بھی جاتا ہوگا، تو اس طرح خانہ کعبہ کی غیر حاضری بہت پریشان کن بات ہے اور اس سے بھی حیرانگی کی بات یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سمیت مکہ سے صرف چھ میل کے فاصلہ پر تھے اور طوافِ کعبہ کی غرض سے تشریف لائے جنہیں روک دیا گیا۔ کعبہ سے اس وقت تو یہ نہ ہو سکا کہ وہاں چلا جائے کعبہ بیشک ان کا طواف نہ کرتا چلا تو جاتا۔ تاکہ صحابہ ہی اس کا طواف کر لیتے۔ کیا ان میں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سمیت کوئی بھی ان بزرگوں کے پائے کا نہ تھا۔ پھر پھر ابراہیم بن ادہم بھی بڑے پائے کے بزرگ ہیں۔ معلوم نہیں انہیں کشف کے ذریعہ یہ کیوں نہ علم ہو سکا کہ کعبہ تو وہاں موجود ہی نہ ہوگا لہٰذا سیدھے رابعہ بصری کے پاس ہی چلے جاتے۔

پھر خانہ کعبہ کا ایسا طواف صرف رابعہ بصریہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں اور بھی کئی ایسے اولیاء اللہ ہیں جن کے گرد خانہ کعبہ خود وہاں پہنچ کر طواف کرتا رہا ہے۔ مثلاً درج ذیل واقعات ملاحظہ ہوں:

خانہ کعبہ کا معین الدین چشتی کے گرد طواف کرنا

آپ فرمایا کرتے تھے کہ حاجی لوگ قالب اور جسم سے خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں لیکن عارف لوگ دل سے عرش و حجاز کے گرد گھومتے ہیں اور لقاء الٰہی چاہتے ہیں۔ آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے ایک مدت تک خانہ کعبہ کا طواف کیا لیکن اب خانہ خدا خود میرا طواف کرتا ہے۔" (سیر الاولیاء، ص ۵۲)

خانہ کعبہ کا خواجہ مودود چشتی (م ۵۲۷ھ) کے ہاں جانا

"منقول ہے کہ جب خواجہ مودود چشتی کو خانہ کعبہ کی زیارت کا اشتیاق غالب ہوتا تو فرشتے خانہ کعبہ کو خدا کے حکم سے خواجہ کے سامنے لا رکھتے۔ خواجہ نہایت ذوق وشوق سے طواف کرتے۔ جب آپ طواف ونماز سے فراغت پا لیتے تو فرشتے خانہ کعبہ کو اٹھا لے جاتے۔" (سیر الاولیاء ص ۴۱)

بشر حافی کا نظریہ حج

اب حج کے متعلق بشر حافی کے خیالات ملاحظہ فرمایئے۔ یہ بالکل ابن عربی کے خیالات یا فتوے سے ملتے جلتے ہیں:

"نقل ہے کہ ایک شخص نے کہا: "میرے پاس ہزار درہم ہیں، میں چاہتا ہوں کہ حج کو جاؤں۔" آپ نے فرمایا: "تو حج کو نہیں جاتا، سیر وتفریح کو جاتا ہے۔ اگر حج سے خدا کی رضامندی چاہتا ہے، تو یہ درہم کسی آزردہ دل حاجت مند کو دے یا کسی عیالدار شکستہ دل کو دے تاکہ اس کا دل خوش ہو اور فکرِ عیال سے آرام پائے یا کسی قرضدار کا قرض ادا کر، تاکہ وہ غم قرض سے خلاصی حاصل کرے۔ اس کے علاوہ بہت سے مسکین، یتیم اور بیوائیں تیرے ان درہموں کے حاجت مند ہیں۔ ان کی خبر گیری اور بھلائی میں صرف کر۔ کیونکہ تیرے اس ایک حج سے ہزار گنا بڑھ کر اس کا درجہ ہوگا۔" (مقربان حق، ص ۸۰)

دیکھئے فریضہ حج کی کس خوبصورت انداز میں نفی کی جارہی ہے اگر یہی اندازِ فکر ہو تو حاجی کبھی حج پر نہیں جا سکتا، کیونکہ حاجت مند تو ہر وقت دنیا میں موجود رہتے ہیں۔ یہ ہے اس "اللہ کے لوگوں پر حق" کی توہین جس کے متعلق حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر استطاعت کے باوجود کسی نے حج نہیں کیا، تو اللہ کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔

عبد اللہ بن مبارکؒ کا نظریہ حج

نقل ہے کہ آپ ایک سال حج کو گئے۔ ادائے حج کے بعد تھوڑی دیر سو گئے۔ خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے اترے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا: اس سال کتنے لوگوں نے حج کیا؟ دوسرے نے جواب دیا: چھ لاکھ آدمی حج میں آئے پہلے تو کسی کا بھی حج قبول نہ ہوا، لیکن پھر حق تعالیٰ نے علی بن موفق نام کفش دوز کے طفیل جو دمشق میں رہتا ہے اور خود حج میں شامل نہیں ہو سکا، سب کا حج قبول کیا ہے۔[1]

"آپ تحقیق کے لئے دمشق روانہ ہوئے اور علی بن موفق کو مل کر صورتِ حال دریافت کی، تو اس نے کہا: "میں تیس سال سے حج کی آرزو کرتا رہا ہوں اور جوتیوں کو پیوند لگا کر زادِ راہ جمع کرتا رہا۔ اس سال تین سو درہم

---

[1] واقعہ کی صحت کی ذمہ داری تذکرہ نگاروں پر ہے۔

ہو گئے، تو میں حج کے لئے تیار ہوا۔ میری بیوی حاملہ تھی۔ ایک رات اس نے مجھ سے کہا: "ہمسایہ کے گھر سے سالن کی خوشبو آرہی ہے۔ تھوڑا سا مانگ لاؤ۔" میں ہمسائے کے گھر گیا، تو اس نے کہا: "بھائی! دینے میں تو کچھ عذر نہیں، لیکن نہ مانگو تو اچھا ہے۔" میں نے وجہ پوچھی، تو اس نے کہا: کئی دنوں سے بچے بھوکے مر رہے تھے۔ آج جنگل میں جا کر مردار کا گوشت لایا ہوں اور وہی پکایا ہے۔" یہ سن کر میرے دل میں اک آگ سی لگی۔ اسی وقت گھر گیا۔ وہ تین سو درہم اس کو دے دیئے اور کہا یہ لو اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو، میں اسی کو حج سمجھوں گا۔ بس میرا یہ عمل ہوا۔" آپ نے فرمایا: "تو نے سچ کہا۔" (مقربان حق، ص ۱۹۶)

ملاحظہ فرمایئے! کہ چھ لاکھ آدمیوں کے بے ٹھکے ہوئے حج صرف اس کفش دوز کے اس نیک عمل کی وجہ سے قبول ہو رہے ہیں جن میں عبداللہ بن مبارک کا اپنا حج بھی شامل ہے۔ جذبہ رحم و ہمدردی کے پردہ میں کس طرح فریضہ حج سے انکار اور اس کی توہین کی جا رہی ہے۔ چھ لاکھ حج اور ان کی مقبولیت اور ثواب کو اس موچی کے صدقہ سے کمتر قرار دیا جا رہا ہے۔ کیا لاجواب افسانہ گھڑا ہے کسی ولی اللہ نے۔

لیکن بات حج بیت اللہ کی توہین تک محدود نہیں۔ اس کے آگے یوں چلتی ہے کہ مزارات کی زیارت کی اہمیت، بیت اللہ کی زیارت سے بہت زیادہ ہے اور وہ سب اعمال و افعال، جو وہاں جا کر کئے جاتے ہیں ان مزاروں اور مقبروں پر بجا لانے کی بھی فضیلت اس سے کسی صورت کم نہیں جس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔

عارفوں کی نماز

اب دیکھئے "عارف" لوگوں کو نماز میں کعبہ کی طرف منہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں:

"شیخ جلال الدین تبریزی بدایوں آئے اور قاضی شہر کے مکان پر ملنے گئے۔ خادموں نے کہا نماز میں مشغول ہیں۔ شیخ نے تبسم کے ساتھ فرمایا: "قاضی صاحب نماز پڑھنا جانتے بھی ہیں؟" دوسرے دن قاضی صاحب شیخ کو ملنے آئے اور کہا: "یہ آپ نے کیسے کہہ دیا تھا کہ قاضی صاحب نماز پڑھنا جانتے بھی ہیں؟" شیخ نے کہا: "عالموں کی نماز دوسری ہوتی ہے اور فقیروں کی دوسری۔" قاضی صاحب بولے: "کیا فقیر کوئی اور قرآن پڑھتے ہیں؟ یا رکوع سجود کسی نئے طریقہ پر کرتے ہیں؟" شیخ نے فرمایا: "عالموں کی نماز بس اسی قدر ہے کہ کعبہ کی طرف نظر کریں یا اگر دور ہیں، تو جہت کعبہ کو۔ لیکن درویشوں کی نماز یوں نہیں ہوتی وہ جب تک عرش الٰہی پر نظر نہیں جما لیتے نماز شروع نہیں کرتے۔" (تصوف اسلام ص ۱۲۰ عبدالماجد دریابادی، بحوالہ فوائد الفواد، ص ۲۳۷ تا ۲۳۹)

دیکھا آپ نے تبریزی صاحب نے کیا دو ٹوک فیصلہ فرما دیا کہ عارفین شریعت اسلامیہ کے احکام کے قوانین کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کا مذہب جدا گانہ ہے اور یہی کچھ ہم کہتے ہیں۔

اشرف علی تھانویؒ کا اعترافِ حقیقت اور مساعی

تو یہ ہیں وہ شرعی بنیادیں جن کے ذریعے طریقت کو شریعت کا ہمنوا یا تابع قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود بھی طریقت ہمیشہ علمائے دین کی نظروں میں کھٹکتی ہی رہی ہے۔ چنانچہ تجدید تصوف و سلوک کے مصنف اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے مُرید خاص عبدالباری سابق استاد فلسفہ و دینیات اس مغایرت کا اظہار ان الفاظ میں کر رہے ہیں :

"پھر یہی اہلِ دنیا ہی نہیں بلکہ ان سے بڑھ کر اکابرین دین تک کو تصوف کے غیر دین یا طریقت کے خلاف شریعت ہونے اور اسی کی بدولت اس سے انکار و توحش کا بہت بڑا شابہ ہوتا ہے کہ حضراتِ صوفیائے کے بہت سے حقائق و معارف، افکار و اشغال، مجاہدات و مراقبات، احوال و کیفیات، توجہ و تصرفات، کشف و کرامات، ترکِ لذت و تعلقات، بیعت و نسبت اور رسوم و عبادات وغیرہ کی خاص خاص صورتوں کا ان حضرات کو کتاب و سنت کی عام و منصوص تعلیمات میں بظاہر نام و نشان نہیں ملتا اور مغالطہ یہ ہوگیا ہے کہ تصوف و طریقت کی اصل و حقیقت یہی "بدعات" ہیں۔" (تجدید تصوف و سلوک ، ص ۳۵)

چنانچہ اشرف علی تھانویؒ نے تصوف و سلوک کو شریعت سے ہم نوا بنانے اور اس کی تجدید کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ آپ کے فیض یافتہ عبدالباریؒ صاحب موصوف لکھتے ہیں :

"اسلامی تصوف کی خود صوفیاء محققین کے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ وہ نام ہے عین اسلام و شریعت کا۔ حتیٰ کہ ہمارے صوفیا اپنا سب سے بڑا صوفی حضراتِ صحابہ، بلکہ رسول اللہ ﷺ کو قرار دیتے ہیں۔ اور یہی خلاصہ ہے اس باب میں حضرت مجدد علیہ الرحمۃ (مولانا اشرف علی تھانوی) کی تجدید کا ...... جیسا کہ اوپر پوری طرح معلوم ہو چکا۔"

WWW.DEENEKHALIS.COM

یعنی دینِ طریقت اور شریعت میں مطابقت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ صحابہ کو بھی "صوفی" ثابت کیا جائے اور حضورِ اکرم ﷺ کو صوفی اکبر۔ چنانچہ یہ مرحلہ بھی سر کر لیا گیا اور حضرت حسن بصری کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت ثابت کر کے حضورِ اکرم ﷺ تک شجرۂ طریقت ملا دیا گیا۔ اس مہم کے لئے جو دوسرا اہم کام کیا گیا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"اتنا ہی نہیں۔ حضرت (مولانا اشرف علی تھانوی) نے تو قرآن وحدیث سے تصوف کے تقریباً دو ہزار مسئلے صاف صاف دلالت سے ثابت کر دیئے ہیں (الافاضات الیومیہ، حصہ ہفتم، ص ۲۰۰) اور فرمایا اگر غور کرتا تو اتنے ہی اور ثابت کر دیتا۔" (تجدید تصوف وسلوک، ص ۱۲۰)

غور فرمایئے کہ ایسے مسائل جن کے متعلق وہ خود اعتراف کر رہے ہیں کہ بظاہر ان کا کتاب وسنت میں نشان نہیں ملتا۔ پھر وہ خود ہی دو ہزار مسائل قرآن وحدیث سے صاف صاف دلالت سے ثابت کر رہے ہیں، تو یہ دلالت کس قدر صاف صاف ہو گی اور اس کے لئے حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کو کس قدر کھینچا تانی کرنی پڑی ہو گی۔ کیا اس سے یہ بہتر نہیں تھا کہ صرف ایک دو ہی نصوص ہوتیں، جو اس قدر قطعی ہوتیں کہ ان میں کھینچا تانی کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے رکن مولانا احمد سعید اکبر آبادی اپنے ماہنامہ "برہان" دہلی میں تھانوی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

"اپنے معاملات میں تاویل وتوجیہ اور اغماض ومسامحت کی مولانا میں جو خو تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی مرید نے مولانا کو لکھا کہ رات خواب میں میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ ہر چند کلمہ تشہد صحیح صحیح ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن ہر بار یہ ہوتا ہے کہ لا الہ الا اللہ کے بعد اشرف علی رسول اللہ منہ سے نکل جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ تھا کہ یہ کلمہ کفر ہے۔ شیطان کا فریب اور نفس کا دھوکہ ہے تم فوراً توبہ استغفار کرو، لیکن مولانا تھانوی صاحب صرف یہ کہہ کر بات آئی گئی کر دیتے ہیں کہ "تم کو مجھ سے غایت محبت ہے یہ سب کچھ اسی کا نتیجہ وثمرہ ہے۔" (برہان، فروری ۱۹۵۲، ص ۱۰۷)

سو یہ ہے ان کوششوں کا خلاصہ اور مختلف تدابیر، جن کے ذریعہ شریعت اور طریقت کو متحد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر ہمارے خیال میں یہ مشرق ومغرب کو اکٹھا کرنے والی بات ہے۔ تا آنکہ موجودہ تصوف سے باطل

نظریات کو کلیتہً خارج نہ کردیا جائے اور ان باطل نظریات کی بھرپور تردید نہ کی جائے اور بدنام اکابر صوفیا سے بدنامی کا داغ دھونے اور ان کے نظریات کو صحیح ثابت کرنے کی روش کو ترک نہ کیا جائے۔

شریعت اور طریقت میں موافقت کی کوشش

تصوف کی اصلاح و تطہیر کے سلسلہ میں تجدید تصوف و سلوک کے مصنف عبدالباری صاحب اور اُن کے مرشد حکیم الامت اشرف علی تھانوی نے کئی پہلوؤں سے قابلِ قدر کوشش بھی فرمائی ہے اور ان سے ہمیں مکمل اتفاق ہے۔ لہٰذا اس عنوان کے تحت ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھیں گے۔ صرف ان حضرات کے اقتباسات بمعہ حوالہ جات پیش کریں گے۔ کیونکہ یہ اقتباس ہمارے خیالات کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔

۱۔ ذکر کیا ہے؟ حصن حصین میں ہے بل کل مطیع اللہ فھوذاکر۔ اس لئے ذکر کے معنی یاد تو سب طریقہ سے ہوتی ہے، نہ کہ محض زبان ہی سے نام لے لے۔ کیا یہ یاد ہے کہ جس کی یاد کا دعوٰے ہو نہ اس سے بات کرے، نہ اس کے خط کا جواب دے، نہ اس سے ملے نہ اس کا کہنا مانے۔ یہ ہرگز یاد نہیں، تو جو ذکر بدوں اصلاح کے ہو، وہ ایسی ہی یاد ہے۔ (تجدید تصوف سلوک، ص ۴؟ بحوالہ الافاضات الیومیہ، ص ۱۹۵، حصہ ۷)

۲۔ مجاہدہ نفس کے مطالبات دو قسم کے ہیں۔ حقوق اور حظوظ۔ حقوق وہ جن سے قوامِ بدن اور بقائے حیات ہے اور حظوظ وہ، جو ان سے زائد ہوں۔ پس مجاہدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حقوق باقی رکھے اور حظوظ کو فانی کرے۔" (تجدید، ص ۱۷)

" افسوس! ستیاناس کر دیا تصوف کا ان جاہل صوفیوں نے اور فقیری کو ہاؤ دہو بنا رکھا ہے۔ کہتے ہیں چلّے کھینچو۔ بیوی کو طلاق دے دو۔ اولاد کو عاق کردو۔ دروازہ کو تیغا کردو اور ایک چار روز کھاؤ۔ بدوں اس کے اصل فقیری نہیں ملتی۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ دوشالوں میں، گدے تکیوں میں، سلطنت میں، مرغن غذاؤں میں، فقیری ملتی ہے، مگر گھر میں نہیں، شیخ کامل کی خدمت میں۔" (اشرف السوانح، حصہ ۲، ص ۱۶۱)

۳۔ زُہد کی حقیقت بہت کم کھانا بھی زہد نہیں نہ یہ مقصود ہے کہ ہمارے کم کھانے سے نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے خزانہ میں توفیر تھوڑا ہی ہو جائے گی۔ ہاں اتنا بھی نہ کھائے کہ پیٹ میں درد ہو جائے۔ ہمارے حاجی (امداد اللہ، اشرف علی کے پیر) کا مذاق تو یہ تھا کہ نفس کو خوب آرام

سے رکھے لیکن اس سے کام بھی خوب لے۔" (تجدید، ص ۵)

"اس لئے صحت کی بہت حفاظت کرے۔ دماغ اور قلب کی تفریح و تقویت غذائ و دوائ کرتا رہے نہ غذا میں اتنی کمی کرے کہ ضعف و یبوست ہو جائے۔ نہ اس قدر افراط کہ ہضم میں فتور ہو جائے۔ جب تک صادق رغبت نہ ہو کھانا نہ کھائے اور ایک آدھ لقمہ کی کسر باقی رہنے پر چھوڑ دے...... اسی طرح سونے میں اعتدال رکھے۔ نہ بہت زیادہ سوئے کہ کسل ہو۔ نہ بہت کمی کرے کہ یبوست ہو جائے۔" (تجدید، ص ۶)

۴۔ استغراق (سُکر)

"لوگ استغراق کو بڑی چیز سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم بے عقل و مدہوش نہ ہوئے تو کمال ہی کیا ہے۔ صاحبو! اللہ تعالےٰ کا نام ہوش بڑھانے کے لئے لیا جاتا ہے نہ کہ کھونے کے لئے..... خواجہ عبید اللہ احرار فرماتے ہیں کہ استغراق میں قرب نہیں بڑھتا۔ کیونکہ اس میں عقل نہیں ہوتا، جو مدار قُرب ہے۔" (تجدید، ص ۶)

"حقیقت میں، جو ذی استعداد کامل ہیں، ان پر نفسیاتی کیفیات (تاثر و انفعال یا سکر) طاری نہیں ہوتیں ہاں روحانی جن کا اثر روح پر ہوتا ہے، کاملین پر طاری ہوتی ہیں۔ جن کا عوام کو پتہ بھی نہیں اور ان دونوں میں فرق جیسے گڑ اور قند کی شرینی میں ہوتا ہے..... تو واقعی جو سالکین متمنی کیفیات کے ہیں وہ دیہاتی گڑ خوار ہیں۔"

(تجدید، ص ۸۷)

۵۔ کشف و کرامات کی حقیقت

" فرمایا لوگ کشف کو بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کو قرب میں کچھ دخل نہیں...... بعضوں کو کشف سے قطعاً مناسبت نہیں ہوتی۔ لاکھ ریاضت و مجاہدہ کریں، عمر بھر کشف نہیں ہوتا۔ اصل چیز تو عبدیت ہے۔ واللہ اگر کسی کو لاکھ کشف ہوں اور پھر وہ اپنے وجدان کی طرف رجوع کرے، تو محسوس کرے گا کہ ذرہ برابر ترقی نہیں ہوئی۔ برخلاف اس کے اگر وہ دو چار مرتبہ سبحان اللہ پڑھ کر اپنے وجدان کو دیکھے تو صاف محسوس ہوگا کہ کچھ نہ کچھ اللہ تعالےٰ کے ساتھ قرب بڑھ گیا۔"

"غرض کشف کوئی بڑا کمال نہیں۔ اگر کافر بھی مجاہدہ و ریاضت کرے تو اس کو ہونے لگتا ہے مجنون (دیوانے) کو بھی کشف ہوتا ہے۔ صاحب شرح اسباب نے لکھا ہے کہ مجنون کو کشف ہوتا ہے۔ میں نے خود دیکھا کہ ایک مجنون کو اس قدر کشف ہوتا تھا کہ بزرگوں کو بھی نہ ہوتا تھا، لیکن اس کا مسہل ہوا تو مادہ کے ساتھ کشف بھی نکل گیا۔"

(سوانح، جلد ۲، ص ۸۷۔ بحوالہ تجدید، ص ۹۰)

"خوارق کا ہونا ولایت کے لئے ضروری نہیں۔ بعض صحابہ سے عمر بھر ایک خرقِ عادت بھی واقع نہیں ہوا خوارق اکثر جوگیوں سے واقع ہوتے ہیں۔ یہ ثمرہ ریاضت کا ہے۔ خرقِ عادت کا مرتبہ ذکرِ قلبی سے بھی کم ہے صاحبِ عوارف نے غیر اہلِ خوارق کو اہلِ خوارق سے افضل لکھا ہے۔ عارفین کی بڑی کرامت یہ ہے کہ شریعت پر مستقیم ہوں اور بڑا کشف یہ ہے کہ طالبانِ حق کی استعداد معلوم کر کے اس کے موافق ان کی تربیت کریں۔"

(تعلیم الدین، ص ۱۰۸، بحوالہ تجدید، ص ۹۰)

"بعض صاف گو حضرات کا فیصلہ ہے کہ الکرامات حیض الرجال، یعنی جیسے عورت حیض سے شرماتی ہے اور اس کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی طرح اہل اللہ اپنی کرامتوں سے شرماتے ہیں۔ بہت سے اہلِ کرامت بزرگوں نے تمنا کی کہ کاش! ہم سے کرامت کا صدور نہ ہوتا۔ وجہ یہ کہ انہوں نے بقدر اپنی کرامت کے درجات آخرت میں کمی محسوس کی۔" (تجدید، ص ۹۱، بحوالہ الرفیق فی سواء الطریق، ص ۳۱)

"پس کرامت وہ کہلاتے گی جب ایسے فعل کا صدور متبع کامل التقویٰ سے ہو۔ اب ہمارے زمانہ میں جس شخص سے کوئی عجیب فعل سرزد ہو جاتا ہے اس کو غوث قطب قرار دے دیتے ہیں۔ خواہ اس کے عقائد و اعمال کیسے ہی ہوں۔ بزرگوں نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کسی کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھو یا پانی پر چلتا، مگر شریعت کا پابند نہ ہو، تو اس کو بالکل ہیچ سمجھو۔" (تجدید، ص ۹۲)

۶۔ توجہ و تصرف کی حقیقت

"توجہ و تصرف بھی نہ کوئی مقصود و مامور امر ہے۔ نہ فی نفسہٖ کوئی کمال و قرب اور ولایت و مقبولیت کی علامت۔ بلکہ نفس و خیال کی ایک قوت ہے۔ جو خیال و توجہ میں یکسوئی کی مشق سے مقبول کیا مردود سے مردود شخص بھی حاصل کر سکتا ہے۔ پرانے زمانے میں سحر یا جادوگری اور آجکل کے مسمریزم اور عملِ تنویم (ہپناٹزم) کا بڑا مدار یہی ہے۔ اسی نفس یا باطن کی قوت سے کسی پر کوئی اثر ڈالنے کا نام صوفیوں کی اصطلاح میں توجہ و تصرف یا ھمت ہے۔ ...... لیکن یہ قوت کوئی دینی کمال نہیں۔ نہ مقبول و مقرب ہونے کی علامت ہے۔ ہر فاسق و فاجر بھی مشق سے اپنے اندر یہ قوت پیدا کر سکتا ہے۔" (تجدید، ص ۹۲، ۹۳ بحوالہ بوادر القواعد، ص ۳۲۴)

"نیز اس (توجہ و تصرف) کے استعمال میں بعض دینی و دنیوی مضرتیں بھی ہیں، خصوصاً اس زمانہ میں حضرت مجدد کا مشورہ اس کے ترک ہی کا ہے۔

دنیوی مضرت تو اس میں یہ ہے کہ اس کے استعمال کی کثرت سے عامل کے دماغی و قلبی قویٰ ضعیف و

مضمحل ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے امراض پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ دینی مضرت یہ ہے کہ دوام اس کو ولایت و بزرگی کی علامت سمجھتے ہیں جو اعتقادی ضرر ہے اور مریدوں کا ضرر یہ ہے کہ اکثر اسی پر قناعت کر بیٹھتے ہیں اور اصلاح کا اہتمام چھوڑ دیتے ہیں، جو عملی ضرر ہے۔ ان ہی مضرتوں کی وجہ سے محققین نے اس کا استعمال چھوڑ دیا ہے۔ سلف کے زمانہ میں یہ مضرتیں قویٰ کی مضبوطی، فطرت کی سلامتی اور خوش فہمی کے سبب موجود نہ تھیں۔ (حوالہ: ایضاً)

"اس کے علاوہ جو لوگ محض شیخ کی توجہ یا تصرف پر قناعت کر لیتے ہیں، تو اس تصرف سے جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ نہ تو ان کا کچھ نفع ہوتا ہے اور نہ اُن کو بقا نصیب ہوتا ہے۔ اصلی نفع و بقا اپنی ہی محنت کی چیزوں میں ہے۔" (تجدید، ص ۹۴)

"چنانچہ بزرگی کا معیار لوگوں نے یہ بھی تراش رکھا ہے کہ جو شخص آنکھیں چار ہوتے ہی مدہوش کر دے اٹھا کر زمین پر پٹک دے، وہ بڑا بزرگ ہے۔ حالانکہ یہ بالکل لغو ہے۔ اگر یہ بزرگی ہے تو حضور اکرم ﷺ کو تو ضرور اس کو برتنا چاہئے تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جب کفار نے آپ کو قتل کرنا چاہا، تو آپ اس کے منتظر رہے کہ یہ لوگ غافل ہو جائیں، تو میں نکل جاؤں۔ کیوں نہ آپ نے ایک ہی نگاہ میں سب کو مدہوش کر دیا۔" (تجدید ص ۹۶ بحوالہ الرفیق، ص ۵۲)

۷۔ بیعت کی اغراض

۱۔ "بعضے مرید صاحب کشف و کرامت بننا چاہتے ہیں، تو اس کا خود شیخ میں ہونا ضروری نہیں، تو مرید اس کی کیا ہوس کرے۔"

۲ "بعضے سمجھتے ہیں کہ پیر بخشش کے ذمہ دار ہو جائیں گے۔ حالانکہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ تک کو فرما دیا تھا:

يَا فَاطِمَةُ اِنْقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ — فاطمہ رضی اللہ عنہا! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ

تو بھلا اور کون پیر کسی مرید کو بچا سکتا ہے۔"

۳ "بعضے چاہتے ہیں کہ پیر صاحب ایک ہی نظر میں کامل کر دیں گے۔ اگر اس طرح کام بن جاتا، تو صحابہؓ کو بھی کچھ نہ کرنا پڑتا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کون کامل النظر ہوگا۔ کہیں بطورِ خرقِ عادت ایسا ہو بھی گیا، تو خوارق میں دوام و لزوم نہیں اور اس بھروسہ پر رہنا بڑی غلطی ہے۔"

۴ "بعضے چاہتے ہیں کہ خوب جوش و خروش، شورش و مستی پیدا ہو۔ گناہ آپ سے آپ چھوٹ جائیں۔ خواہش

ہی مٹ جائے۔ نیک کاموں میں ارادہ ہی نہ کرنا پڑے۔ بس ایک محویت کا عالم رہا کرے۔ یہ خیال پہلے خیالوں سے پاکیزہ سمجھا جاتا ہے، لیکن منشا اس کا بھی ناواقفی ہے۔ یہ امور منجملہ کیفیات و احوال کے ہیں، جو اختیار سے خارج ہیں اور اگرچہ محمود ہوں مقصود نہیں بلکہ ایسی خواہشوں میں نفس کا ایک خفی کید ہوتا ہے کہ وہ طالب ہے راحت و لذت و شہرت کا اور ان کیفیات میں یہ سب امور حاصل ہیں .... پھر ایسا شخص دو قسم کی خرابیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ اگر یہ کیفیات حاصل ہوگئیں، تو اپنے کو صاحبِ کمال سمجھنے لگتا ہے یا کم از کم طاعات کو حقیر سمجھنے لگتا ہے اور اگر حاصل نہ ہوئیں، تو ان کے غم میں مرنے لگتا ہے اور جو غیر اختیاری امور کا طالب ہوگا ہمیشہ مبتلائے غم و پریشانی رہے گا۔"

۵ "بعض سمجھتے ہیں کہ پیر صاحب کے عملیات بڑے مجرب ہیں، بوقت ضرورت ان سے تعویذ گنڈے لے لیا کریں گے یا پیر صاحب بڑے مقبول الدعوات ہیں۔ معاملات و مقدمات میں ان سے دعا کرایا کریں گے۔ سب کام ہو جایا کریں گے۔ گویا ساری خدائی پیر صاحب کے قبضہ میں ہے۔ یا خود ہم ایسی ہی چیز سیکھ لیں گے۔ بلکہ ایسے لوگ تمام تر بزرگی کا معیار انہی عملیات اور ان کے آثار کو سمجھتے ہیں، جو محض دنیا کی طلب ہے اس لئے فاسد در فاسد ہے۔"

۶ "بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ذکر و شغل کرنے سے کچھ انوار نظر آیا کریں گے یا کچھ آوازیں سنائی دیں گی۔ اول تو ذکر و شغل پر نہ ان آثار کا مرتب ہونا ضروری ہے اور نہ ذکر و شغل سے یہ مقصود ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ انوار و اصوات وغیرہ بعض اوقات خود اس کے دماغ کا تصرف ہوتا ہے۔ عالم غیب کی اشیاء میں سے نہیں ہوتی (محض اس کا تخیل اور وہم ہوتا ہے) تیسرے بالفرض اسی عالم کی چیزیں منکشف ہوگئیں، تو فائدہ کیا۔ کسی عالم کے منکشف ہو جانے سے قرب نہیں بڑھتا۔ قرب کے لئے تو اطاعت بنائی گئی ہے۔ بعض اوقات شیاطین کو ملائکہ نظر آنے لگتے ہیں مگر وہ شیطان کے شیطان ہی رہتے ہیں۔ پھر مرنے کے بعد تو مومن کافرسب ہی کو اس عالم کے بہت سے حقائق منکشف ہو جائیں گے۔ تو کیا اس سے قرب مقصود سب کو حاصل ہو جائے گا۔" (تجدید ص ۴۰۱ تا ۱۰۷۔ بحوالہ: قصد السبیل)

۸ بیعت کی ضرورت

اس معاملہ میں فریقین نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ ایک فریق اس کو سرے سے بدعت قرار دیتا ہے۔ دوسرا اسے لازم سمجھتا ہے۔

بیعت سے اصل مقصد رضائے حق کو سمجھنا اور اس پر کاربند رہنا ہے۔ بیعت دراصل پیر اور مرید کے درمیان

ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ پیر اُسے احکام شرعیہ کے بجالانے اور ذکر کی مداومت کی تاکید کرے اور مرید اس کا نسبتاً زیادہ خیال رکھے۔ مجدّد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

"شیخ اسی کی تعلیم کرتا ہے اور مرید کاربند ہوتا ہے۔ اگرچہ کوئی کیفیت معلوم نہ ہو۔ نہ اس کے زعم کے مطابق کوئی کمال حاصل ہو۔ تب بھی آخرت میں اس کا ثمرہ، جو کہ رضا ہے ظاہر ہوگا اور اس رضا سے دخولِ جنت و لقائے حق اور دوزخ سے نجات میسر ہوگی۔ شیخ کی طرف سے اس کی تلقین کا وعدہ اور مرید کی طرف سے اس کے اتباع کا عہد یہی حقیقت ہے پیری، مریدی کی . . . اور گو یہ تعلیم اور اس پر عمل بدوں بیعت کے بھی ممکن ہے، لیکن بیعت میں طبعًا یہ خاصہ ہے کہ شیخ کو توجہ زیادہ ہو جاتی ہے اور مرید کو فرمانبرداری کا پاس زیادہ ہو جاتا ہے۔ مگر لوگوں نے یوں سمجھ رکھا ہے کہ جو بھید ہیں فقیری کے، وہ جنا نچھر ہیں پریم کے۔ وہ مریدوں کو ہی بتائے جاتے ہیں۔ مرید کرتے ہی پیر بس پریم کے دو انچھر بتا دے گا اور ہم اللہ والے ہو جائیں گے۔ میاں خُدا و رسول کا نام لو اور احکام بجالاؤ۔ بس یہی انچھر ہیں۔ اصلاحِ نفس کے طریقے پیر سے پوچھو۔ یہی بھید ہیں۔ اگر کوئی کہے کیا باطنی طریق بس یہی ہے، تو ہم باوازِ دُہل کہیں گے کہ ہاں یہی ہے اور اس طریق میں کبھی کبھی بڑے بڑے حالات پیش آئیں گے۔ بڑی بڑی کیفیات بھی طاری ہوں گی مگر یہ مقصود نہیں۔" (نہ ضروری ہے)

(تجدید، ص ۱۰۹ بحوالہ: اشرف السوانح، ج ۲، ص ۱۶۱)

"بیعت کی اصلی بڑی ضرورت یہی رفاقت یا پیر کی صحبت و تعلق ہے۔ تاکہ راستہ کے خطرات یا ان ٹھوکروں سے حفاظت ہو . . . . . اور ہمارے لئے تو صحبت کی حاجت کی سب سے بڑی دلیل صحابیت ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کی فضیلت بھی اعلیٰ سے اعلیٰ محدثین و فقہاء پر مسلّم ہے . . . . اور اس فضیلت کا مدار رسول اللہ کی صحبت پر ہے۔" (تجدید، ص ۱۱۱، ۱۱۲)

تقوے پر ایک وعظ میں اللہ کی محبت پیدا اور قائم رہنے کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"اس محبت کے قائم رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کیجئے۔ زیادہ نہ ہو تو کم از کم ہفتہ میں ایک بار یا مہینہ میں ایک بار۔ اس میں خاصیت یہ ہے کہ اس کے اندر جو چیز ہے، وہ شدہ شدہ آپ کے اندر بھی آوے گی۔" (تجدید، ص ۱۱۷)

۹۔ محبت اور عشق

"البتہ حق تعالیٰ کی محبت میں شانِ عقلیت غالب ہوتی ہے اور اپنے ہم جنس کی محبت میں شانِ طبعیت (عشق) غالب ہوتی ہے اور سرسری نظر میں

محبّت عقلی، محبّت طبعی کے سامنے مضمحل معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ اَمر بالعکس ہے۔ چنانچہ اسی محبوبِ طبعی سے نعوذ باللہ حق تعالےٰ کی شان کے خلاف کوئی معاملہ قولی یا فعلی صادر ہو تو وہی محبوب فوراً مبغوض ہو جائے۔" (تجدید، ص ۱۳۳، بحوالہ: اشرف السوانح، ج ۲، ص ۱۲۷)

اشرف علی تھانوی کی مساعی جمیلہ پر تبصرہ

یہ اور ایسی ہی اور بھی کچھ مفید باتیں ہیں، جن سے موجودہ تصوف کی کسی حد تک اصلاح ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ تمام باتیں صرف ایک پہلو سے تعلق رکھتی ہیں یعنی "پیر پرستی" کے سلسلہ میں اصلاح ہو سکتی ہے۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ آپ نے بیعت کے عنوان میں جن اغراض کی نشاندہی فرمائی ہے۔ یہی باتیں تو عوام کے لئے باعثِ کشش ہوتی ہیں۔ اگر یہ باتیں ختم ہو جائیں، تو کتنے لوگ ایسے رہ جائیں گے جو خلوص کے ساتھ اور محض اتباعِ سنت کی غرض سے کسی بزرگ کے درِ دولت پر بیعت کے لئے حاضر ہوں گے؟

اور اس سے بھی بڑا محاذ قبروں کا وجود ہے۔ جہاں سب اکابر صوفیا چلہ کشی کرتے چلے آئے ہیں۔ حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے قبروں کے پختہ بنانے ہی سے سختی سے منع فرمایا۔ کیونکہ اکثر شرکیہ افعال کی جڑ تو یہی قبروں اور مزارات کا وجود ہے۔ اس سلسلہ میں تھانوی صاحب اور ان کے شاگردِ رشید خاموش نظر آتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جاہل عوام کو زندہ پیروں سے اتنی دل بستگی نہیں ہوتی، جتنی قبروں سے ہوتی ہے۔ قبروں پہ جا کر لوگ چلے کاٹتے، نذریں نیازیں چڑھاتے، طواف کرتے، مرادیں مانگتے، سجدے کرتے اور سالانہ حج بھی ادا کرتے ہیں۔ کیا یہ بات قابلِ اصلاح نہیں۔ کیا یہ باتیں بزرگ صوفیاء سے تعلق نہیں رکھتیں یا یہ اتباعِ سنت میں نہیں آتیں؟

پھر اس سے بھی بڑا محاذ نظریات کا محاذ ہے۔ جہاں آکر سب کی زبانیں گنگ ہی نہیں ہوتیں بلکہ اکثر باتوں ان اکابر صوفیاء کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔ بعض دوسرے ایسے مشرکانہ عقائد کو اپنی سمجھ سے بالاتر قرار دے کر اپنا پہلو بچا جاتے ہیں۔ کچھ دوسرے تاویلات کے ذریعہ ان کے نظریات کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا ان اکابر کی خلافِ شرع باتوں کے مقابلہ کے ان کی موافق شرع کی باتیں پیش کر کے ان کی تنزیہہ کرنے لگتے ہیں۔ قرآن نے تو اپنی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ پیش کی ہے کہ اس میں آپ تضاد نہیں پائیں گے، تو پھر جس کے کلام میں صریح تضاد پایا جاتا ہو، اسے حق کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ نظریاتی پہلو ہی دراصل سب سے خطرناک پہلو ہے، جس نے بے دین اور مجرم قسم کے پیر وفقیر پیدا کئے، جن سے

کرامتیں وقوع پذیر ہوئیں۔ اور ہمارے خیال کے مطابق صوفیاء اس محاذ پر سب سے زیادہ بدنام ہوئے ہیں، تو کیا یہ پہلو اصلاح یا تطہیر کے قابل نہیں ؟

پھر ایک وہ محاذ بھی ہے جہاں سے اکابر صوفیاء یُوں بولتے ہیں "حدثنی قلبی عن ربی" تو بھلا ایسے بلند مقام پر فائز حضرات احادیث کی کیا پرواہ کرتے ہیں۔ جس چیز کو چاہا حلال اور مباح قرار دے لیا۔ دعویٰ تو وہ اتباعِ سنت کا کرتے ہیں۔ کیا اسی کا نام اتباعِ سنت ہے ؟ بالآخر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ؎

پنبہ کجا کجا نہم تن ہمہ داغ داغ شُد

سیّد خورشید احمد گیلانی اور رُوحِ تصوّف

جب میں اس کتاب کا مسودہ مکمل کر چکا، تو جناب سیّد خورشید احمد گیلانی صاحب کی کتاب روحِ تصوف پر نظر پڑی، جس پر آپ نے موجودہ تصوف پر اعتراضات دُور کرنے اور اسے خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور آپ نے مشورہ دیا ہے کہ اصلی تصوف کو جاننے کے لئے امہاتِ کُتبِ تصوّف کی طرف رجُوع کرنا چاہیئے۔ پھر آپ نے چند مشہور اُمّہاتِ کتب سے تعارف بھی کرایا ہے اور ان کے بعض مندرجات بھی پیش فرمائے ہیں اور اس بات پر زور دیا ہے کہ تصوف کے اصل مسائل اور موضوعات اللہ کا ذکر، تقویٰ، توبہ، صبر، توکل، رجاء، فقر، محاسبہ، تزکیۂ نفس، خشیت، امانت، اخلاص، سادگی، قناعت، دنیا سے نفرت اور اللہ تعالےٰ کے لئے حنیف ہونا ہی تو ہیں۔ بتلایئے ! ان موضوعات میں سے کس چیز کی بنیاد شریعت اسلامیہ میں موجود نہیں۔ پھر انہی مسائل پر مختلف امہاتِ کُتُب کے تراجم سے اقتباسات بھی پیش کئے گئے ہیں۔

ہم آپ کے اس جذبہ کی قدر ضرور کرتے ہیں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے اس طرح سے تصوف کی تطہیر میں جانبداری سے کام لیا ہے۔ جس کے دلائل درج ذیل ہیں :

۱۔ آپ لکھتے ہیں ابوالنصر سراج (م ۳۷۸ھ) نے اپنی کتاب "اللمع" میں اتحاد و حلول جیسے باطل نظریات کی تردید و تغلیظ فرمائی ہے۔ (ص ۸۱)

اب سوال یہ ہے کہ ان صوفیاء کے طبقہ نے ابُوالنصر کی اس بات کو تسلیم کیا ہے؟ اگر یہ حضرات خود ہی تسلیم نہ کریں، تو دوسرے کیسے کر سکتے ہیں اور جناب خورشید احمد صاحب نے جانبداری یہ کی ہے کہ جن امہاتِ کُتب میں یہ نظریات بالوضاحت مذکور ہیں ان کو امہاتِ کُتب کی فہرست سے ہی خارج کر دیا ہے۔ مثلاً :

۱۔ حسین بن منصُور حلاج (م ۳۰۹ھ) کی کتاب "الطواسین" ، حارث محاسبی (م ۲۴۳ھ) کے رسالہ "الوعایۃ"

کے بعد دوسری کتاب تصوف۔

۲ امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کی کتاب "المنقذ من الضلال"

۳ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (م ۶۳۸ھ) کی کتب فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم۔

۴ عبدالکریم جیلی کی کتاب "الانسان الکامل"

۵ مولانا جلال الدین رومی (م ۶۷۲ھ) کی کتاب مثنوی مولانا رُوم

۶ شیخ فریدالدین عطار (م ھ) کی کتاب "منطق الطیر" وغیرہ وغیرہ بے شمار کُتب ہیں، جو امہاتِ کُتب میں شمار ہوتی ہیں، لیکن اُن کا ذکر آپ اس لئے چھوڑ گئے کہ ان کُتب میں اس نظریہ کو بنیاد کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور یہی نظریہ دراصل دینِ طریقت یا تصوف کی جان ہے، جو شرعی نقطۂ نگاہ سے مردود اور باطل ہے اور اسلام سے ہزارہا سال پہلے کی پیداوار ہے۔

۲۔ پھر اس حقیقت کا اعتراف پیش لفظ لکھنے والے جناب سید محمد فاروق القادری صاحب نے بھی ان الفاظ میں کیا ہے: "ہمیں دارا شکوہ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ تصوف اسلام سے بہت پہلے انسانی فکر میں آچکا تھا۔ اور اُپنشدوں میں اس کی مستند تصریحات ملتی ہیں۔ لیکن اسے اس تصوّف سے کیا واسطہ ہے جس کے داعی اپنے تمام معتقدات و معمولات کی بنیاد صرف قرآن کو ٹھہراتے ہیں۔"

اب دیکھیے! جس دارا شکوہ کے حوالہ سے آپ نے بات چلائی ہے۔ اسی دارا شکوہ کے مرشد مُلا بدخشی کا یہ شعر کیا قرآن کے مطابق ہے؟ ؎

پنجہ در پنجہ خُدا دارم   من چہ پروائے مصطفےٰ دارم

لیکن بایں ہمہ اس اسلامی تصوف کے طبقہ میں دارا شکوہ بھی ایک معزز رُکن ہیں اور اس کے استاد مُلا بدخشی بھی۔

۳ اگر اُپنشدوں میں تصوف کی مستند تصریحات کو اسلامی تصوف سے کوئی واسطہ نہیں تو کیا وجہ ہے کہ ان امہاتِ کُتب کے مصنفین عوام کو شروع سے لے آج تک یہ یقین دلاتے چلے آرہے ہیں کہ طریقت بھی شریعت ہی سے ماخوذ ہے لیکن ان کی یقین دہانیوں کے باوجود بھی عوام کو یقین نہیں آتا۔ بات واضح ہے کہ کچھ صوفیا تو تصوّف کو کتاب و سنت سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں اور جو کتاب و سنت کا نام لیتے ہیں ان میں سے بھی اکثر کے اعمال شریعت کے مطابق نہیں ہوتے۔

۴ پھر جن امہاتِ کتب کا خورشید صاحب نے ذکر فرمایا ہے ان کے مندرجات میں سے متنازعہ فیہ مسائل کو عمداً چھوڑ گئے ہیں۔ ہم نے اس کتاب میں آپ کی پسندیدہ کتب میں سے اکثر کتب کے حوالوں سے ہی یہ وضاحت پیش کی ہے کہ طریقت اور شریعت آپس میں متصادم ہیں۔

گویا آپ نے کیا یہ ہے کہ تصوف کے جو پہلو مستحسن یا گوارا تھے انہیں تو خوب صورت بنا کر پیش کر دیا ہے لیکن جتنے پہلو قابلِ اعتراض تھے ان پر پردہ پوشی کی گئی ہے۔ ایسے انداز کو تحقیقی نہیں کہا جا سکتا۔ علاوہ ازیں جو باتیں اس کتاب میں جواب طلب یا بحث طلب تھیں، وہ چونکہ پہلے ہی زیر بحث آ چکی ہیں، لہٰذا مزید کچھ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی گئی۔

اب ہم شریعت اور طریقت کا ایک تقابلی خاکہ پیش کرتے ہیں تاکہ ایک نظر میں معلوم ہو جائے کہ ان دونوں کا تصادم کون کون سے مقام پر ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ طریقت اور شریعت میں مکمل سمجھوتہ قابلِ عمل ہے بھی یا نہیں؟

شریعت و طریقت کا تقابلی جائزہ

۱۔ توحید: اسلام میں توحید یہ ہے کہ ساری کائنات اللہ کی مخلوق اور اسی کی مطیع فرمان ہے۔ حاکمیت اور فرمانروائی بھی اسی کی ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔	۱۔ طریقت کی توحید یہ ہے کہ جملہ موجودات خدا کا حصہ ہیں۔ پھر کوئی انسان اپنی ذات کو خدا میں مدغم بھی کر سکتا ہے اور کسی انسان میں خدا خود بھی حلول کر سکتا ہے، جس کی وجہ سے اس میں خدائی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔
۲۔ رسالت: نبی اور رسول اپنے وقت کے تمام انسانوں میں سے افضل ہوتا ہے۔	۲۔ نبوت سے نبیؑ کی ولایت افضل ہے بالفاظِ دیگر نبی سے ولی افضل ہوتا ہے۔ اسی طرح خاتم الانبیاء سے خاتم الاولیاء افضل ہوتا ہے۔
۳۔ مشاہدہ الٰہی: اس دنیا میں ناممکن ہے نہ ظاہری آنکھوں سے نہ دل کی آنکھوں سے اور اگر کوئی ایسا محسوس کرتا ہے تو وہ شیطانی فریب ہے۔	۳۔ دیدارِ الٰہی ممکن ہی نہیں ضروری ہے اور اسی بنیاد پر اس دین کا دارومدار ہے۔ مشاہدات اور مکاشفات ہی اس دین کے سرچشمے اور بنیاد ہیں۔
۴۔ وحی الٰہی: اکتسابی نہیں بلکہ وہبی چیز ہے اور	۴۔ وحی الٰہی کی ابتداء ریاضت و مجاہدہ ہے اور یہ

نبی کو وحی آنے سے پیشتر خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ نبی بننے والا ہے۔	کسبی چیز ہے۔ انسان کو وحی کی توقع ہوتی ہے اور یہ ایک تدریجی عمل ہے۔
۵۔ معیارِ حق : وحی الٰہی ہے یعنی قرآن و سنت سے شرعی احکام مستنبط ہوتے ہیں اور یہی چیزیں تحقیق اور جانچ کا معیار ہیں۔	۵۔ اصل معیار مشاہدہ و مکاشفہ ہے کیونکہ یہ علم فرشتہ سے واسطہ کے بغیر براہِ راست خدا سے حاصل ہوتا ہے۔
۶۔ نبی یا رسول کی غیر مشروط اطاعت لازم ہے۔	۶۔ نبی کے بجائے اپنے پیر کی غیر مشروط اطاعت لازم قرار دی گئی ہے۔
۷۔ نبی کے صحیح جانشین علماء ہوتے ہیں اور علماءؔ زاہدوں اور عبادت گزاروں سے بہت افضل ہیں۔	۷۔ نبی کے اصل جانشین زاہد اور عابد (صوفیاء) ہیں اور یہ علماء سے افضل ہیں اور مقربینِ حق یہی لوگ ہیں۔
۸۔ روحانی ترقی کا راستہ دنیا کے اندر سے ہو کر جاتا ہے اور اسلام معاشرتی زندگی گزارنے پر زور دیتا ہے۔	۸۔ روحانی ترقی دنیا کو ترک کرنے سے ہی ہو سکتی ہے، لہٰذا صوفیاء اپنا راستہ دنیا سے باہر رہ کر تلاش کرتے ہیں۔
۹۔ زہد : حصولِ دنیا اور حلال کمائی کرنا بہت نیک عمل ہے البتہ حُبِ دنیا ناپسندیدہ چیز ہے اسی چیز کا نام زہد ہے۔	۹۔ حصولِ دنیا اور اس سے انتفاع ترقی کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس میں زہد کا تصور اسلامی زہد سے بالکل مختلف ہے۔
۱۰۔ نکاح : معاشرتی زندگی کی اصل بنیاد اور فطری چیز ہے، لہٰذا ضروری ہے۔ وہ ایک عہد و پیمان ہے، نکاح کے علاوہ دوسرے سب راستے حرام ہیں۔	۱۰۔ نکاح اور عائلی زندگی سے سخت بیزار ہے۔ بعض اتحادی ہر عورت سے زنا کو جائز سمجھتے ہیں اور جماع کو مشاہدہ حق کا بہترین موقع قرار دیتے ہیں۔ بعض دوسرے بزرگ تفنن طبع کے لئے بھی نکاح کرتے ہیں۔
۱۱۔ جہاد : قومی زندگی کی حیات کے لئے جہاد بالسیف افضل الاعمال قرار دیتا ہے۔	۱۱۔ جہاد بالسیف کو کمتر سمجھتا اور اس کے بجائے مجاہدۂ نفس پر زور دیتا ہے اور روحانی ترقی کی آڑ میں انسانیت کو ذلیل ترین مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔

۱۲۔ تقدیر: انسان اپنے اعمال میں نہ تو مختارِ مطلق ہے نہ مجبورِ محض۔ البتہ ہر عمل مشیتِ الٰہی کے تابع ہوتا ہے۔	۱۲۔ نظریہ وحدت الوجود کے مطابق انسان اعمال میں مجبورِ محض ہے۔ اس کی حیثیت محض ایک آلۂ کار کی ہے، جو مشیتِ الٰہی کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا ہے۔
۱۳۔ معاشی اور سیاسی نظام کے لئے مکمل ہدایات دیتا اور کلمۂ حق کے استیلاء کے لئے سلطنت کے حصول پر زور دیتا ہے۔	۱۳۔ ظاہری حکومت کو بیکار سمجھتا اور اس کے بجائے باطنی نظام پر زور دیتا ہے، غوث، قطب، ابدال، اوتار، نجیب وغیرہ کے مناصب مقرر کرتا ہے اور ان کے نصب وعزل کا نظام جاری کرتا ہے۔
۱۴۔ جزا و سزا: اسلام، اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کے انعامات کی امید رکھتے ہوئے اس کی عبادت کو ایک مستحسن فعل قرار دیتا ہے۔ اخروی زندگی میں نجات کا انحصار اعمال پر ہے۔ بُرے ہوں گے، تو دوزخ ٹھکانہ ہوگا اور اچھے ہوں گے، تو بہشت۔ رضائے الٰہی اور دیدارِ الٰہی صرف اہلِ جنت کو حاصل ہوگا۔	۱۴۔ صوفیاء اس نظریۂ عبادت کی توہین کرتے اور اس کو "سوداگری" قرار دیتے ہیں۔ وہ اعمال میں انسان کو مجبور سمجھتے اور جنت اور دوزخ کو بے معنی چیزیں قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں معیار رضاء الٰہی ہے۔ رضاء الٰہی کی خاطر وہ دوزخ میں بھی بخوشی جانے کو تیار ہیں۔ وہ اسے ایک آہ سرد سے ٹھنڈا کر کے بیکار بنا سکتے ہیں اور جنت کو پھونک مار کر دوزخ بنا سکتے ہیں۔
۱۵۔ اتباعِ رسول اور محبت کے تقاضے: اسلام دینی اور دنیوی ترقی کے لیے اتباعِ رسول کو بنیاد اور اسی کو اللہ اپنی اتباع قرار دیتا ہے۔ اللہ سے اور اس کے رسول سے محبت ایمان کا بنیادی تقاضا ہے پھر رسول کے اہلِ بیت سے محبت بھی رسول کی محبت کا تقاضا قرار دیتا ہے، لیکن اس محبت کا مقصد محض اتباعِ رسول میں عزم ہے نہ کہ عقائد، اصول و اقدار شرعیہ	۱۵۔ یہاں مقصود صرف روحانی ترقی اور معرفتِ حق ہے اور اس کی بنیاد عشق ہے، جو اللہ کے سوا ہر چیز کو جلا دیتا ہے اور انسان کو بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ گروہ سخت ذہنی انتشار میں مبتلا ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک فریق رسول کی اتباع کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا دوسرا اتباعِ رسول کے بجائے عشقِ رسول میں اتنا غلو کر گیا کہ حضور اکرم ﷺ کو یونانی فلسفہ کے مطابق عقلِ کُل قرار دیتا ہے اور انہیں ازل سے

کی قربانی۔	لے کر ابد تک حاضر ناظر، عالم الغیب اور تصرف کائنات پر قادر سمجھتا ہے۔ ایک تیسرا فریق حُبِ اہلِ بیت میں شیعوں سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ اور ان کے دلائل محض اپنے مشاہدات یا بزرگوں کے ملفوظات ہیں۔
۱۶۔ مزارات کا وجود۔ اسلام انسان کے مرنے کے بعد رُوح کے اس دنیا میں آنے کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ فلہٰذا سماع موتیٰ، روحوں سے سوال وجواب، ان روحوں کا تصرف سب کو باطل قرار دیتا ہے اور اگر ایسی چیزوں کا ظہور ہو تو اسے شیطانی عمل قرار دیتا ہے۔ لہٰذا اسلام میں پختہ قبروں کے جواز کے سب چور دروازے بند کر دیئے گئے ہیں، جو کہ ایسے شرکیہ افعال کا اصل منبع ہیں۔	۱۶۔ صوفیاء کے نزدیک رُوحوں کا واپس دنیا میں آنا، سماع موتیٰ، ان سے سوال وجواب اور تصرفات ان کے مشاہدے کے مطابق سب برحق ہیں۔ لہٰذا اس مذہب کے لئے پختہ قبریں، مقبرے، روضے، مزار، خانقاہیں بنیادی ضرورت کی چیزیں ہیں۔
۱۷۔ اعتکاف: اسلام نے روحانی ترقی اور خالص توجہ الی اللہ کے لئے مساجد میں اعتکاف کرنے کی راہ دکھلائی ہے۔	۱۷۔ صوفیاء مساجد میں اعتکاف کے بجائے مزارات پر مراقبہ کرنے کو اصل نیکی سمجھتے ہیں۔
۱۸۔ حج: اسلام نے حج بیت اللہ کو فرض اور اسلام کا رکن قرار دیا ہے اور مناسکِ حج کو شعائر اللہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔	۱۸۔ اہلِ طریقت کے نزدیک اتنی ہی رقم سے غریبوں کی امداد کر دینا زیادہ مستحسن عمل ہے۔ بیت اللہ کا درجہ عارف سے کمتر ہے۔ فلہٰذا بیت اللہ خود عارف لوگوں کے گرد طواف کرتا ہے۔ بیت اللہ کی زیارت سے کسی بزرگ کے مقبرہ کی زیارت افضل ہے اور وہاں مناسکِ حج کی ادائیگی زیادہ کارِ ثواب ہے سالانہ عرس حج کا بدل یا اس سے افضل سمجھے جاتے ہیں
۱۹ کرامات: اولیاء اللہ سے کرامات کا ظہور برحق ہے۔ اولیاء اللہ وہ ہیں، جو اتباعِ رسول کا مکمل نمونہ ہوں۔ کرامت کا مقصد کسی اہم دینی یا دنیوی غرض کو پورا کرنا ہے۔ ولی کو اس کے ظہور سے	۱۹ صوفیاء کی کرامات لامحدود ہیں۔ وہ ازل سے ابد تک کے حالات کی خبر لاتے اور تصرف فی الامور میں کافی دسترس رکھتے ہیں زبانی اقرار کے باوجود اتباعِ رسول کو بے معنی اور اپنی کرامات کو دعوے

پہلے سے علم نہیں ہوتا۔ نہ وہ اس کے صدور کا دعوےٰ کر سکتا ہے اور یہ بھی شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتی ہے۔	سے پیش کرتے اور اپنی بزرگی کی دھاک بٹھلاتے ہیں اور یہ سب کسب و اکتساب سے حاصل کیا جاتا ہے۔
۲۰ علمِ غیب کُلّی اللہ تعالےٰ کا خاصہ ہے وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے، عطا کرتا ہے۔	۲۰ علمِ غیب رسول اللہ ﷺ کو کلی حاصل تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ خدا کا علم ذاتی ہے اور رسول کا عطائی پھر یہ عطائی علمِ غیب اکثر اوقات اولیاء اللہ کو بھی ہوتا ہے اور بعض کو تو کلی ہوتا ہے۔
۲۱ وفات کے بعد تمام انبیاء و اولیاء کی زندگی برزخی ہے جس کو ہم سمجھ نہیں سکتے۔	۲۱ رسول اکرم ﷺ اور تمام انبیاء و اولیاء زندہ ہیں وہ مرتے نہیں بلکہ صرف عام دنیا والوں سے روپوش ہو جاتے ہیں اور اہلِ دنیا کی حاجت براری میں مشغول رہتے ہیں۔
۲۲ تصرف فی الامور کا رتبہ صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ باقی سب اس کی مخلوق، اس کی محتاج اور اس کے آگے بے بس ہے اور اسی کے رحم و کرم پر ہے۔	۲۲ انبیاء، اولیاء، سب کو تصرف فی الامور کا مرتبہ حاصل ہے اور یہ اولیاء لوحِ محفوظ میں اللہ کے لکھے ہوئے فیصلوں تک کی تبدیلی بھی کروا سکتے ہیں۔
۲۳ - قیامت کے دن شفاعت صرف وہی کر سکے گا جس کی اپنی مغفرت ہو چکی ہو اور پھر اُسے اللہ کی طرف سے اس کی اجازت بھی مل جائے۔	۲۳ - اولیاء اللہ دعوے سے مریدوں کی شفاعت اور مغفرت دونوں کا ذمہ اٹھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ قبر میں منکر نکیر کے سوال کے وقت بھی اپنے بے دین مریدوں تک کو حکماً بخشوا سکتے ہیں۔
۲۴ - حاضر و ناظر صرف اللہ تعالےٰ کی ذات ہے۔ وہی ہر ایک کی پکار سنتا اور اسے قبول کرتا ہے اس کے بغیر کسی دوسرے کو پکارنا صریح شرک قرار دیتا ہے۔	۲۴ - تمام انبیاء و اولیاء ہر وقت حاضر و ناظر ہوتے ہیں پکار کے وقت مرید کی جائے مصیبت پر پہنچ کر اس کی مشکل کشائی بھی کر دیتے ہیں[1] خواہ یہ پیر صاحب زندہ ہوں یا مُردہ۔

[1] یہ عقیدہ بھی عجب قسم کا تضاد رکھتا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور اولیاء ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔ اور اس کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ مرید کے پکارنے پر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حاضر و ناظر تو وہ پہلے ہی ہیں پہنچ کہاں سے جاتے ہیں۔ اگر حاضر ناظر ہیں، تو پہنچنے والی بات غلط اور لغو ہے۔ اور پہنچنے والی بات ٹھیک ہے، تو حاضر ناظر والی بات لغو اور باطل ہے۔

مشائخ عظام سے چند سوالات

اس کتاب میں دو باتوں کی وضاحت کی گئی ہے :

۱۔ دینِ طریقت بذاتِ خود ایک الگ دین ہے جس کے اپنے مخصوص عقائد و نظریات ہیں ۔

۲۔ جو شخص یہ دین اختیار کرتا ہے، تو اُس پر اسی کا رنگ غالب آجاتا ہے اور اس کے پہلے دین (مثلاً اسلام، عیسائیت یا ہندومت وغیرہ) کی حیثیت ثانوی بن کر رہ جاتی ہے[1]۔ اگرچہ وہ زبانی اُس کی تردید بھی کرتا رہے ۔

اب ہمارے صوفیاء کو اصرار ہے کہ طریقت شریعت ہی سے ماخوذ ہے ۔ شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ۔ اگر اُن کا یہ دعوٰے صحیح ہے تو کیا براہِ کرم درج ذیل سوالات کا جواب دینے کی تکلیف فرمائیں گے ۔

۱۔ کیا وحدتُ الوجود کا عقیدہ یا حلول و شہود کے عقائد کی از روئے شرع گنجائش ہے ؟ اگر ہے تو دلائل سے مطلع فرمائیں ۔ ورنہ یہ بتلائیں کہ ایسے عقائد کے حامل صوفیاء کی حمایت کیوں کی جاتی ہے ؟

۲ کیا اسلام میں پختہ قبریں بنانے، ان پر سر بفلک عمارات تعمیر کرنے، ان پر چراغ جلانے، روشنیاں کرنے جھاڑو دینے، غلاف چڑھانے، اعتکاف بیٹھنے، طواف کرنے کا جواز ہے ؟

۳۔ قبروں پر چلّہ کشی کرنے، حبسِ دم، ہمیشہ روزہ رکھنے، پوری رات قیام کرنے اور ہمیشہ قیام کرنے، نفس کو اذیتیں پہنچا کر مضمحل کرنے، نکاح نہ کرنے کو بہتر سمجھنے اور ترکِ علائق کی از روئے شرع گنجائش ہے ؟

۴۔ کیا جتنی وحی رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھی خصوصاً جس کا تعلق دین سے تھا۔ وہ آپ نے سب کی سب اُمت کو پہنچا دی تھی یا اس میں سے کچھ باطنی حصہ عوام کو نہیں بتلایا گیا ؛ زیادہ واضح الفاظ میں کیا دین کا کچھ حصہ اسرار و رموز کی صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیا گیا تھا، جو اس طبقہ کے پیشوا تسلیم کئے گئے ہیں ؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس کی دلیل درکار ہے، اگر نفی میں ہو تو تصوّف میں باطنی علوم کے ماخذ کیا ہیں ؟ اور صوفیاء جو اپنے ہم رتبہ لوگوں سے خلوت میں اسرار و رموز کی باتیں کرتے ہیں، وہ دین کی باتیں ہوتی ہیں یا کچھ اور ؟ اور اگر دین کی باتیں ہوتی ہیں، تو انہیں عوام سے چھپایا کیوں

---

[1] صوفیاء کے ہاں یہ مقولہ بہت مشہور ہے " الصوفی لا مذہب لہٗ " جس کا یہی مطلب ہے ۔

جاتا ہے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "بَلِّغُوا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً" یعنی کسی کے پاس دین کی صرف ایک بات بھی ہو تو اسے لوگوں تک پہنچانا چاہیئے۔

۵۔ کیا تصورِ شیخ کی از روئے شرع گنجائش ہے؟

۶۔ کیا اخروی نجات کے لئے سلوک کی منازل طے کرنا ضروری ہے؟ اگر جواب نفی میں ہو تو کیا اس کا ترک بہتر نہیں جبکہ اس کے مصالح سے اس کے مفاسد بہت زیادہ ہیں، خصوصاً ایسے ادوار میں جبکہ تحریکِ باطنیت اس تصوف پر بُری طرح محیط ہو چکی ہے۔

۷۔ کیا کشف کا علم یقینی ہے۔ اگر جواب نفی میں ہے تو جن صوفیاء نے شریعت کے بجائے اپنے کشف پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

۸۔ جس رہبانیت کو اسلام نے ناپسند فرمایا تھا اس رہبانیت اور موجودہ تصوف میں مابہ الامتیاز فرق کیا ہے؟

۹۔ محفلِ سماع و وجد اور حال کی کوئی مثال دورِ صحابہ میں ملتی ہے اگر یہ چیزیں کچھ فضیلت رکھتی ہیں تو صحابہؓ کا دور ان سے کیوں خالی ہے؟ اور اگر مذموم ہیں تو ان کو اختیار کرنے کے مصالح کیا ہیں؟

۱۰۔ کیا وجہ ہے کہ تین چار لاکھ صحابہ سے، جو پوری ایک صدی پر پھیلا ہوا ہے، تو دس[1] بارہ سے زیادہ کرامات وقوع پذیر نہیں ہوئیں۔ لیکن صوفیاء کے ایک ایک بزرگ سے بیسیوں بلکہ سینکڑوں کرامات وقوع پذیر ہونا تذکروں سے ثابت ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات یہ کرامات اتنی رفیع الشان ہوتی ہیں کہ ان کے مقابلہ میں انبیاء کے معجزات ہیچ نظر آنے لگتے ہیں؟ کیا یہ استدراج تو نہیں ہوتا؟

۱۱۔ ایسی قبور یا مزارات جہاں کسی انسان کے بجائے مردہ حیوان کی ہڈیاں دفن کی جاتی ہیں یا وہ بھی نہیں ہوتیں۔ ایسے مزارات سے لوگوں کی حاجت روائی کی کیا وجوہ ہیں؟

۱۲۔ اہلِ طریقت نے جو باطنی نظام مقرر کر کے غوث، قطب، ابدال، اوتاد وغیرہ کے مناصب کی تعیین کر رکھی ہے اور ایک بڑا ولی، چھوٹے ولی کی پل بھر میں ولایت ختم کر دیتا ہے اور کسی نئے شخص کو آنِ واحد میں ولایت عطا کر بھی دیتا ہے۔ ان باتوں کا عہدِ نبوی میں کہیں سراغ ملتا ہے؟

۱۳۔ کیا وجہ ہے کہ علمائے تصوف، آغازِ تصوف سے ہی علمائے شریعت کو یہ یقین دہانی کراتے چلے

---

[1] ان میں سے بھی بعض واقعات محلِ نظر ہیں۔ اور آٹھویں باب میں ان پر مفصل تبصرہ گزر چکا ہے۔

آئے ہیں کہ طریقت یا تصوف شریعت ہی سے ماخوذ ہے اور شریعت کے اتباع کے بغیر چارہ نہیں مگر علمائے شریعت نے کسی دور میں بھی ان کی اس بات کا اعتبار نہیں کیا۔ اور ہمیشہ گرفت کرتے چلے آئے ہیں؟

۱۴۔ جن "اولیاء اللہ" کے متعلق تذکرہ نگاروں کی یہ شہادت موجود ہے کہ وہ خلاف شریعت کام کیا کرتے تھے۔ ان کو عزت و تکریم کا مستحق کیوں سمجھا جاتا ہے؟ ان کو قدس سرہٗ کیوں لکھا جاتا ہے؟ اور انہیں اولیاء اللہ کی فہرست سے خارج کیوں نہیں کیا جاتا؟

۱۵۔ کیا ایسے صوفی جو لامذہب تھے ان کو مسلمان کہنا یا اولیاء اللہ سمجھنا درست ہے؟

محترم قارئین! آپ نے ساری کتاب کا بغور مطالعہ کیا۔ محترم والد صاحب نے یہاں مشائخ عظام سے 15 سوالات کئے ہیں۔ ان کے جوابات آج تک نہ ہی کسی رسالے کی معرفت اور نہ بالمشافہ ہمیں موصول ہوئے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب فضولیات آج بھی اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر ہو رہی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں رسول اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ایک آدمی نے دوران گفتگو عرض کیا کہ "جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں" آپ ﷺ نے سن کر فرمایا "کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا ہے؟" (مسند احمد) ایک آدمی نے آپ ﷺ سے بارش کی دعا کرانا چاہی اور عرض کیا کہ "ہم اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ کے ہاں سفارشی بناتے ہیں۔" آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور فرمایا "افسوس تجھے معلوم نہیں۔ اللہ کی شان کتنی بلند ہے اسے کسی کے حضور سفارشی نہیں بنایا جا سکتا۔" (ابوداؤد) آپ ﷺ نے حیات طیبہ کے آخری ایام میں مرض الموت میں جو خطبہ دیا وہ محتاج وضاحت نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے انبیاء (علیہم السلام) کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔" (صحیح بخاری)

اس کے بعد یہ مزارات' عرس' اسلام کے نام پر دین خانقاہی اور صوفیاء کی خود ساختہ کرامات' چہ معنی دارد؟ ہماری کسی سے ضد بازی یا عناد نہیں ہے۔ اگر کوئی ایک آدمی بھی اس تحریر سے راہ ہدایت پا جائے تو یہ ہمارے لئے باعث سعادت ہے۔ ورنہ کتاب سے مالی منفعت حاصل کرنا نہ تو محترم والد صاحب کی سوچ تھی اور نہ ہی ہمارا شیوہ۔ اگر والد صاحب کی یہ تصنیف واقعی آپ کے دل کو اپیل کرتی ہے تو میری گزارش ہے کہ ان کے لئے دعائے مغفرت ضرور کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہم سب پر بھی اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

پروفیسر نجیب الرحمٰن کیلانی

جامع مسجد الایمان' شاہ فرید آباد' ملتان روڈ' لاہور۔ فون: 7844157

WWW. DEENEKHALIS.COM

کتابیات

۱ قرآن مجید، تراجم وتفاسیر حسب ضرورت۔

۲ متفرق کتبِ احادیث، حسب ضرورت۔

۳	تعرف، محمد بن ابراہیم کلاباذی، ترجمہ پیر محمد حسن،		المعارف. گنج بخش روڈ، لاہور۔
۴	انسان کامل، عبدالکریم جیلی	" فضل میراں،	نفیس اکیڈمی، کراچی۔
۵	کشف المحجوب، علی ہجویری	"	ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور۔
۶	الفقر والتصوف (عربی)	امام ابن تیمیہؒ	
۷	الفکر الصوفی (عربی)	عبدالرحمن عبدالخالق	، دارالتراث الاسلامی، کویت۔
۸	فضائح صوفیہ "	"	" "
۹	غایۃ الامانی فی الرد علی النبہانی	محمود شکری آلوسی	(اردو ترجمہ زیر طبع)
۱۰	ذکرِ الٰہی وابل الصیب	امام ابن قیمؒ	مکتبہ احیاء السنۃ، گھر جاکھ، ضلع گوجرانوالہ
۱۱	البلاغ المبین (فارسی)	شاہ ولی اللہ	مکتبہ سلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور
۱۲	دائرہ المعارف الاسلامیہ		پنجاب یونیورسٹی، لاہور
۱۳	تصوفِ اسلام	عبدالماجد دریابادی	
۱۴	خلاصہ تصوفِ اسلام	آقا بیدار بخت	تاج بک ڈپو، اردو بازار، لاہور
۱۵	روحِ تصوف	خورشید احمد گیلانی	فرید بک سٹال، اردو بازار، لاہور
۱۶	دلائل السلوک	مولانا احمدیار خان	ادارہ نقشبندیہ، اویسیہ، چکوال
۱۷	تزکیۂ نفس	امین احسن اصلاحی	ملک سنز، فیصل آباد
۱۸	سوانح امام ابنِ تیمیہ	کوکن عمری ایم اے	جامعہ حیدرآباد دکن
۱۹	تاریخ مشائخ چشت	خلیق احمد نظامی	مکتبہ عارفین کراچی
۲۰	" " "	شیخ الحدیث مولانا زکریا	مجلسِ نشریاتِ اسلام، کراچی
۲۱	تاریخ دعوت وعزیمت	ابوالحسن علی ندوی	دائرۃ المعارف، ندوہ
۲۲	مذہب وتجدید مذہب	پروفیسر عبدالحمید صدیقی	البدر پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور
۲۳	توحیدِ خالص	کیپٹن مسعود عثمانی	توحید روڈ، کیماڑی، کراچی
۲۴	الفاروق	شبلی نعمانی	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
۲۵	تلاشِ حق (اردو ترجمہ)	امام غزالی	
	المنقذ من الضلال	خالد حسن قادری (مترجم)	محکمہ اوقاف، پنجاب، لاہور

۲۶	تجدید تصوف و سلوک	عبدالباری، استاد فلسفہ و دینیات	کتب خانہ الفرقان لکھنؤ
۲۷	اسلامی نظریات میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور
۲۸	سیر الاولیاء،	محمد بن مبارک میر خورد ترجمہ غلام احمد بریاں	الکتاب، گنج بخش روڈ، لاہور
۲۹	گلزار ابرار،	محمد غوثی شطاری ترجمہ فضل احمد	اسلامک بک فاؤنڈیشن سمن آباد، لاہور
۳۰	اختلاف امت کا المیہ	فیض عالم صدیقی	چٹان پرنٹنگ پریس، لاہور۔
۳۱	حضرت مجدد کا نظریہ توحید	برہان احمد فاروقی	مقبول اکیڈمی، لاہور
۳۲	حقیقت وحدت الوجود	خواجہ عبدالحکیم انصاری	قاسم سنز، انارکلی، لاہور
۳۳	نظریہ حلول اور اسلام	فضل الرحمٰن کلیم	ادارہ دعوت سلفیہ ملتان
۳۴	ریاض السالکین	عبدالغفور عرشی قادری	ادارہ سہروردیہ اعظم مارکیٹ، لاہور۔
۳۵	خزینۃ الاصفیاء،	غلام سرور مفتی ترجمہ مفتی محمود عالم ہاشمی	المعارف، گنج بخش روڈ، لاہور
۳۶	صوفیائے نقشبند	سید امین الدین	مقبول اکیڈمی، لاہور
۳۷	سیرت غوث الثقلین	ضیاء اللہ قادری	قادری کتب خانہ سیالکوٹ
۳۸	حدیقۃ الاولیاء	غلام سرور مفتی	المعارف گنج بخش روڈ، لاہور
۳۹	مقربان حق (خلاصہ تذکرۃ الاولیاء)	حافظ احمد دین چشتی	قرآن سوسائٹی، لاہور۔ ساہیوال
۴۰	الاویس (تذکرہ اویس قرنی)	ارشد اویسی	اویسیہ پبلشرز، بلال گنج، لاہور
۴۱	سرچشمہ حیات	عبدالعزیز قادری	تبلیغ سوسائٹی، قصور پورہ، لاہور
۴۲	تلقین مرشد کامل اردو ترجمہ حدائق الاخیار	محمد صادق فرغانی	محمد بشیر اینڈ سنز، اردو بازار لاہور
۴۳	معین الہند	ڈاکٹر ظہور الحسن شارب	المعارف، گنج بخش، لاہور
۴۴۔	نور مبین	اے۔ جے۔ چنارا	اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہند بمبئی
۴۵	بریلویت (اردو)	علامہ احسان الٰہی ظہیر	ادارہ ترجمان السنۃ۔ لاہور
۴۶۔	تاریخ پاک و ہند (ساتواں ایڈیشن)	پروفیسر عبداللہ ملک	قریشی برادرز۔ اردو بازار لاہور
۴۷۔	رضا خانی مذہب	سعید احمد قادری	تنظیم اہل السنۃ والجماعۃ نواں کوٹ لاہور۔
۴۸	تصوف کی حقیقت	غلام احمد پرویز	ادارہ طلوع اسلام۔ لاہور

www.DEENEKHALIS.COM

شریعت و طریقت

اس کتاب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اسلام میں تصوّف کا آغاز کب
اور کیسے ہوا اور آج تک اس میں کیا کچھ آمیزشیں ہو چکی ہیں؟
کیا طریقت کے عقائد و نظریات وحدت الوجود ، وحدت الشہود اور حلول کا
شریعت کے سیدھے سادے عقائد کے ساتھ سمجھوتہ ممکن ہے؟
طریقت کا باطنی نظام کیا چیز ہے؟ اور کیا طریقت شریعت کے
تابع ہے یا اس کے متوازی اور اس سے متصادم
ایک الگ دین ہے؟

ڈسٹری بیوٹر

DARUSSALAM

دار السلام
پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
الریاض ہیوسٹن لاہور